ماہنامہ

کتاب نما

خصوصی شمارہ

صالحہ عابد حسین نمبر

کتاب نما کا خصوصی شمارہ

صالحہ عابد حسین نمبر

ترتیب

عزیز قریشی

صلاح کار

ذکیہ ظہیر　　صغرا مہدی

ماہنامہ کتاب نما۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

اڈیٹر: شاہد علی خاں

مہمان اڈیٹر: عزیز قریشی

جلد نمبر ۲۹

ضمیمہ شمارہ نمبر ۱۲۔ دسمبر ۱۹۸۹ء

قیمت سالانہ۔ پینتالیس روپے

فی پرچہ: پانچ روپے

غیر ممالک کے لیے: ۲۳۰/- روپے

تقسیم کار

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنس بلڈنگ، بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

بار اول: نومبر ۱۹۸۹ء | تعداد 500 | قیمت: 45/-

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں طبع ہوئی

فہرست

عزیز قریشی

اداریہ

"کتاب نما" جیسے مؤقر جریدے کے مہمان مدیر ہونے کا نہ میرا منصب ہے نہ اہلیت۔ یہ بات میں انکساری کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ ویسے میرا یہ خیال ہے، علم وادب کے میدان میں ان ہی لوگوں کو آنا چاہیے جنھوں نے اس کے حصول اور اس کی خدمت میں ایک عمر گزاری ہے، میں علم وادب کی دنیا پر غاصبانہ قبضہ کرنے کے حق میں نہیں ہوں جیساکہ آج کل ہو رہا ہے۔

لیکن مکتبہ جامعہ کے روح رواں جناب شاہد علی خاں نے مجھے یہ دعوت اس لیے دی کہ خاکسار کو بیگم صالحہ عابد حسین سے گہری عقیدت و محبت تھی اور ہے اور کتاب نما کے اس نمبر میں میری شرکت کا یہی واحد جواز ہے۔ میں اس لیے بھی انکار نہیں کر سکا کہ شاہد علی خاں سے جو مجھے تعلق ہے اور ان کی جو عنایتیں میرے شاملِ حال رہی ہیں اس وجہ سے بھی ان کا حکم ٹالنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

جون ۱۹۸۲ء کی بات ہے ایک پروفیسر صاحب میرے پاس آئے اور انھوں نے یہ اطلاع دی کہ بیگم صالحہ عابد حسین کچھ دنوں کو بھوپال تشریف لا رہی ہیں اور یہ فرمایش کی کہ ان کے ٹھہرنے کا انتظام کسی گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس میں کرا دوں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ میری طرف سے بیگم صاحبہ سے درخواست کریں کہ وہ میرے غریب خانے پر تشریف لائیں اور قیام کریں انھوں نے دہلی فون کیا اور مجھے یہ خوشخبری دی کہ بیگم صاحبہ نے میری دعوت قبول کرلی۔ میں ان کو ان کی تصانیف کے ذریعے جانتا تھا خاص طور سے ان کی تصنیف "یادگارِ حالی" یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ڈاکٹر عابد حسین جیسے دانشور اور بلند پایہ ادیب کی رفیق حیات اور خواجہ غلام السیدین جیسے ماہر تعلیم (جن سے خاکسار کو ملاقات کا شرف حاصل تھا) کی بہن ہیں۔ اور میں ان کے بارے میں اتنا ہی جان پاتا اگر وہ میرے گھر پر میرے ساتھ قیام نہ فرماتیں۔ میں ان کی دلکش اور دلنواز شخصیت سے ناواقف ہی رہتا۔ وہ جس اپنائیت اور محبت سے ہمارے گھر پر رہیں اور مجھ پر جس محبت اور شفقت کی بارش کی اس کی یاد میرے دل میں ہمیشہ رہے گی۔ اور یہ تعلق اور بھی گہرا ہوگیا جب میرا قیام زیادہ تر دہلی میں

رہنے لگا۔ اسی لیے جب وہ جدا ہوئیں تو اُن کی جدائی کا غم میرا ذاتی غم بن گیا۔ ان کی شخصیت کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار چند لفظوں میں کرنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ بس اتنا کہہ سکتا ہوں ؎

مت سہل اسے جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اختر حسین رائے پوری نے پریم چند کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا "پریم چند کے نزدیک فن ایک کھونٹی تھا، حقیقت کو لٹکانے کے لیے وہ سماج کو بہتر بنانا چاہتے تھے۔" میری ناچیز رائے میں بیگم صالحہ عابد حسین کی تخلیقات پر چاہے ناول ہوں یا افسانے یہی بات صادق آتی ہے۔ پریم چند کے بعد مجروح انسانیت کے زخموں پر ان ہی کے اسٹائل میں پھاہا رکھنے کی کوشش جن لوگوں نے کی ان میں بیگم صالحہ عابد حسین کا نام سر فہرست ہے۔ انھوں نے بلا شبہ اپنی تخلیقات سے پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا۔ بغیر کسی جھنڈے میں لپیٹے انھوں نے اپنے قلم کو کسی مخصوص نظریہ کے ہاتھوں گروی بھی نہیں رکھا۔ یہ اور بات ہے کہ فلسفۂ عدم تشدد کی تبلیغ نمایاں طور پر ان کی تحریروں میں ملتی ہے۔ ممکن ہے یہ اثر ہو، اس عظیم روایت کا جو ورثے میں انھیں حالی سے ملی یا پھر اس قرب کا اثر ہو جو ان کے رفیق حیات کو مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور بادشاہ خان سے تھا اس کی وجہ جو بھی ہو یہ بات بالکل صاف ہے کہ بیگم صالحہ عابد حسین کے نزدیک زندگی چاند ستاروں طاؤس و رباب کا گیت نہیں تھی، انھوں نے اپنی تحریروں میں آسمانوں کی سیر نہیں کرائی۔ انھوں نے اپنا رشتہ زمین سے استوار رکھا اور اپنی تحریروں میں عام انسانوں کے دکھ درد، خوشیوں، کامیابیوں اور ناکامیوں کو سیدھے سادے انداز سے بیان کیا۔ انھوں نے بہت کم عمری سے لکھنا شروع کیا اور آخر تک لکھتی رہیں حکومت اور بعض اداروں نے ان کو انعاموں اور اعزازات سے نوازا، انھوں نے اسے خوشی سے قبول کر لیا جو نہیں ملا اس کا کوئی شکوہ نہیں کیا۔ وہ اصلی فنکار تھیں اس لیے وہ ستایش کی تمنا اور صلے کی پروا کم کرتی تھیں۔ وہ مشہور ناول نگار اور افسانہ نویس کی حیثیت سے ہوئیں مگر انھوں نے اور بھی علمی ادبی تنقیدی اور تحقیقی کام کیے ہیں۔ انیس پر اُن کی متعدد کتابیں اور "یادگار حالی" جن میں سب سے زیادہ اہم ہیں بیگم صالحہ عابد حسین کے اٹھ جانے سے اردو ادب میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا ممکن نہیں ہے اس لیے کہ وہ اپنے طرز کی منفرد ادیبہ تھیں۔

کتاب نما کے اس شمارے میں جن حضرات و خواتین کے مضامین بیگم عابد حسین کی سیرت و شخصیت پر ہیں، وہ ان سے کسی نہ کسی طرح بہت قریب رہے ہیں مگر ان میں سے اکثر میں جذباتیت کے بجائے معروضی انداز نمایاں ہے۔ جن لوگوں نے ان کے فن پر اظہار خیال کیا ہے وہ بھی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ان کے فن کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کو سمجھا اور پرکھا ہے۔ مگر ان کے فن پر ہمیں زیادہ مضامین نہیں مل سکے اور ان کے فن کا خاطر خواہ جائزہ نہیں لیا جا سکا ہے۔ اس احساس کے ساتھ ادب دوستوں کا یہ حقیر نذرانہ بیگم صالحہ عابد حسین کی یاد میں پیش کیا جا رہا ہے۔

کرنل بشیر حسین زیدی

میری بہن — صالحہ عابد حسین

ریاست رام پور کے مرجر کے بعد میرا تعلق پارلیمنٹ سے ہوگیا۔ پہلے بہ حیثیت ممبر مجلسِ آئین ساز اور بعد میں ممبر لوک سبھا۔ اس لیے میں نے طے کیا کہ دہلی میں سکونت اختیار کی جائے۔ ویسے بھی میرا بچپن دہلی ہی میں گزرا تھا اور تقریباً تمام تعلیم یہیں ہوئی تھی۔ اور اسی کو میں اپنا وطن سمجھتا تھا۔ اب سوال تھا کہ مکان کہاں بناؤں۔ میرے محبوب دوستوں ذاکر صاحب، اور عابد صاحب کی سکونت جامعہ نگر میں تھی۔ سیدین صاحب کا مکان یہاں خود میری نگرانی میں تعمیر ہوا تھا۔ اس لیے دہلی کے فیشن ایبل علاقوں کو چھوڑ کر میں نے جامعہ نگر میں بسنا پسند کیا۔ جن کی وجہ سے یہاں گھر بنایا تھا وہ ایک ایک کر کے داغِ جدائی دے گئے۔ صرف میری بہن مصداق (بیگم صالحہ عابد حسین) میری نجی زندگی کا سرمایۂ عزیز باقی رہ گئیں۔ مرحومہ نے مجھے ہمیشہ بھائی کہا اور سمجھا اور وہ بھی مجھے سگی بہن کی طرح عزیز تھیں۔ میرے دل بہلنے کی جگہ عابد ولا تھا۔ اگر دو دن وہاں جا کر اُن سے نہ ملتا تھا تو وہ بہت دفعہ خرابی صحت کے باوجود آہستہ آہستہ چل کر مجھ سے ملنے آتی تھیں۔ ان کی مفارقت سے میری اپنی زندگی میں بڑا خلا واقع ہوگیا ہے۔ ان کے علمی و ادبی کارناموں اور تخلیقات کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جائے گا۔ اس لیے میں ان کی شخصیت اور کردار کے چند پہلوؤں پر کچھ روشنی ڈالنا چاہوں گا۔

خدا نے انھیں سراپا محبت بنایا تھا۔ میں کیا وہ تو اپنے پرائے سب کے لیے ہمدردی اور محبت کا سرچشمہ تھیں۔ وہ بہت غیور اور خوددار تھیں۔ اپنے لیے کسی سے امداد چاہنا انھوں نے کبھی گوارا نہیں کیا۔ البتہ ضرورت مندوں کے لیے دوسروں کے

سامنے ہاتھ پھیلانے میں انھیں تامل نہ ہوتا تھا۔ ان کو مالی فراغت کبھی نصیب نہیں ہوئی نذرِ سائل تھی جہاں تک لیکن درخورِ ہمت اقتدار نہ تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ کتنے حاجت مند لوگوں کے لیے وہ اپنے اوپر سختیاں سہ کر گپت دان کرتی تھیں۔ مالی امداد کے علاوہ ان کی محبت، رفاقت، مشوروں اور اخلاقی مدد سے بے شمار لوگ خصوصاً نوجوان طالب علم فیض یاب ہوئے۔ ناانصافی، خصوصاً کمزور اور پس ماندہ لوگوں کے لیے وہ کبھی برداشت نہ کرتی تھیں۔ اور ضرورت ہو تو ان کے لیے لڑ بھی پڑتی تھیں۔ صاحب ثروت اور اہلِ جاہ لوگوں سے ملنے میں انھیں بہت تامل ہوتا تھا۔ مگر دانش وروں، ادیبوں، شاعروں، فنکاروں، طالب علموں اور نوجوان لڑکوں لڑکیوں سے وہ بہت خوشی سے ملتی تھیں۔ خاکساروں سے خاکساری تھی۔ سربلندوں سے انکسار نہ تھا۔ دوستوں کے لیے ان میں بہت خلوص اور وضع داری تھی۔ لیکن ان کی کسی غلطی پر ٹوکنے میں انھیں تامل نہ ہوتا تھا۔ ان میں عابد صاحب کی شخصیت کی نمایاں خوبیاں رچ بس گئی تھیں۔ اور انسانی ہمدردی، وفاداری، استواری، صاف گوئی اور پختہ عقائد ان کی خصوصیات تھیں۔

اللہ تعالےٰ نے انھیں ذہن رسا سے نوازا تھا۔ مولانا حالی سے انھیں علم و ادب، تہذیب و ثقافت اور پختہ مذہبی عقائد ورثہ میں ملے تھے۔ سیدین صاحب کی تربیت نے ان کی صلاحیتوں کو ابھارا اور شادی کے بعد ڈاکٹر عابد حسین جیسے دانش ور، مفکر، ادیب اور اعلا اقدار والے شوہر کی محبت نے ان کی شخصیت کی تکمیل کی۔ ان کی طبیعت بہت شگفتہ تھی۔ انھیں زندگی کا لطف اٹھانا اور اسے اوروں میں بکھیرنا آتا تھا۔ کبھی کبھی گھر سے نکل کر کھلی فضا میں کہیں وقت گزارنا۔ گرمیوں میں عابد صاحب کے ساتھ کسی پہاڑ یا کسی فرحت بخش مقام پر چند ہفتے گزارنا انھیں بہت پسند تھا۔ آخر عمر میں انھوں نے بہت صدمے اٹھائے۔ اظہر عباس اور سیدین جیسے بھائیوں۔ عزیز جیسی بھاوج اور آخر میں خود عابد صاحب کی جدائی نے انھیں اُدھ موا کر دیا۔ ان کی صحت بہت گر گئی مگر آخر وقت تک ان کی ادبی اور علمی سرگرمیاں، اوروں کی خدمت کا جذبہ ہمدردی خلوص اور وضع داری قائم رہی۔ اپنے نظریات، خیالات اصول اور عقائد کے ساتھ وہ ہمیشہ وفادار رہیں۔ اور ان کی تصنیفات ناول، افسانے، مضامین اور علمی زندگی اس پر شاہد ہیں۔

دردِ دل پاسِ وفا، جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی۔ اور یہی انساں ہونا

آج وہ ہمارے درمیاں نہیں ہیں لیکن ان کی یاد کبھی فراموش نہ ہوگی۔ اور آڑے وقت میں جب پریشانیاں گھیرے ہوں ان کی مثال ہماری ہمت بڑھائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ نہ معلوم انھیں کس کام کے لیے طلب کیا گیا ہے اور خدا کی خدائی میں کہاں ان کی ضرورت ہے۔

ہوگا کسی فلک پہ وہ خورشید جلوہ گر
کہتے ہیں آفتاب کبھی ڈوبتا نہیں

قرۃ العین حیدر

صالحہ باجی

بیگم صالحہ عابد حسین مرحومہ ایک ایسی غیر معمولی ہستی تھیں کہ ان کے متعلق مجھے کچھ لکھنا بہت مشکل معلوم ہو رہا ہے۔ ان کے خاندان کے ہمارے گھرانے سے خواجہ غلام الحسنین کے دور سے تعلقات تھے۔ خواجہ غلام السیدین یلدرم کے مداحین میں سے تھے اور یلدرم بھی ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ صالحہ باجی اس تمدن کی نام لیوا تھیں جو وضع داری کے مفہوم سے واقف تھا۔ وہ ایک مشفق، ملنسار، پر خلوص اور باوقار خاتون تھیں اور علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اصلاح پسند روشن خیال اہل قلم خواتین کے اسطوری دور سے تعلق رکھتی تھیں۔ اسطوری میں نے اس لیے لکھا کہ وہ دور اب پی۔ ایچ۔ ڈی کے طلبا اور طالبات کے لیے ریسرچ کا ایک موضوع بن چکا ہے (اور ریسرچ کا مطلب ہے گم شدہ یا نایاب چیزوں کی کھوج اور چھان بین) لہٰذا ڈاکٹر عابد حسین یا صالحہ عابد حسین کے عہد کے متعلق تحقیق کی جائے تو اس کے یہ معنی بھی ہوں گے کہ ہم ان اقدار اور ان روایات سے کتنی دور نکل آئے ہیں۔ عبرت۔

ایک وقت تھا جب پرانے شانتی نکیتن کی طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی ایک ہالہ سا اپنے گرد رکھتا تھا۔ اس کے اساتذہ وہ آدرش وادی نوجوان تھے جو بوجہ شدید قوم پرستی برطانیہ کے بجائے حصول تعلیم کی غرض سے جرمنی جاتے تھے۔ اور واپس آکر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں قلیل تنخواہوں پر گزر کرتے

تھے۔

اس تاریخی ادارے سے قطع نظر، علاحدہ سیاق و سباق میں ان مذکورہ تینوں الفاظ کے مفہوم خاصے بدل گئے ہیں۔ جامعہ یعنی درسگاہوں میں درس و تدریس نہیں ہوتی۔ ملت کا مفہوم تو بہت ہی متنازعہ فیہ ہوچکا ہے اور اسلامیہ بھی رواداری اور سادگی کے بجائے اب پیٹرو ڈالر اور تنگ نظری سے عبارت ہے۔ بہرکیف تو وہ نوجوان نہایت قوم پرست بھی تھے اور ان کا اسلام خلفائے راشدین اور حضرت ابوذر غفاری کو اپنا آیڈیل بناتا تھا۔ چنانچہ نان جویں پر مدار رکھنے والے یہ اساتذہ اور ان کی بیویاں بڑی سخت کوشی سے زندگیاں بسر کرتے تھے۔ ڈاکٹر عابد حسین اور صالحہ عابد حسین بھی اسی لیجنڈری گروہ میں شامل تھے۔ ایک المیہ یہ ہے کہ ان سب کی کاوشیں اور یہ قومی اور اسلامی آیڈیل "قوم" اور "اسلام" کی مختلف و متضاد تاویلوں اور ان کے نتائج کی وجہ سے تقریباً رائگاں گئیں

کہا جاسکتا ہے کہ قومی جدوجہد کے زمانے کا جوش و خروش اور ولولہ اسی پیمانے اور سطح پر حصول آزادی کے بعد قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات سے ان آدرش وادیوں کی دلوں پہ کیا گزری لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آیڈیلز سے دست بردار نہ ہوئے اس کا اندازہ ڈاکٹر عابد حسین سے مل کر ہی ہوسکتا تھا۔

بیگم صالحہ عابد حسین کو میری والدہ مرحومہ مصداقی کہتی تھیں جوان کے گھر کا نام تھا۔ پہلی بار جب میں نے ان کو دیکھا وہ قرول باغ میں والدہ مرحومہ سے ملنے آئی تھیں اور اپنی کتاب "نقش اول" ساتھ لائی تھیں۔ اس وقت کسی کو اندازہ نہ تھا کہ قرول باغ میں عنقریب قتل عام ہونے والا ہے۔ اس کے بعد ہی جامعہ ملیہ اوکھلا منتقل ہوا۔

ایک مدت بعد صالحہ باجی سے میری ملاقات کرشن چندر کے یہاں بمبئی میں ہوئی صالحہ باجی ڈاکٹر عابد حسین کے ہمراہ جرمنی سے واپس آئی تھیں۔ بمبئی میں قیام

پذیر متعدد نامور ترقی پسند ادیب وشاعر اس دعوت میں موجود تھے دور ترقی پسندی بھی اس وقت تک ختم ہوچکا تھا۔ محض ایک روشن لکیر باقی تھی۔ چند سال بعد ان دونوں سے دلّی کے امپیریل ہوٹل میں ایک کانفرنس کے دوران ملاقات ہوئی۔

اگلی بار جب میں دلّی آئی ڈاکٹر عابد حسین صاحب فراش تھے۔ عابد ولا میں رات کے وقت دور روشن بارش اور متبسّم چہرے دکھلائی دیے۔ ڈاکٹر عابد حسین اور ان کے کزن حکیم میرن صاحب۔ ڈاکٹر صاحب "اسلام اور عصر جدید" مجھے ہمیشہ بھیجا کرتے تھے اس کے اوّلین شمارے پر السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا میں میرا ریویو پڑھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ یہ موجودہ نظریاتی افراتفری اور ہٹ دھرمی کے نقارخانے میں اس رسالے کا اجرا ڈاکٹر عابد حسین کی مستحکم ترقی پسندی اور ہمت کا ایک بیّن ثبوت تھا۔

میں بمبئی میں رہتی تھی۔ اس کے بعد عابد ولا ڈاکٹر صاحب کی تعزیت ہی کے لیے صالحہ باجی کے پاس آسکی۔ وہ شال اوڑھے بڑے کمرے میں تخت پر سوگوار بیٹھی تھیں۔ ان دونوں نے جدوجہد آزادی اور اس کے بعد کے زمانے کے کیسے کیسے نشیب وفراز دیکھے۔

وہ مسند صالحہ باجی کی مخصوص نشست تھی۔ ملاقاتیوں کی آمد پر وہ اپنے کمرے سے آکر وہیں بیٹھ جاتی تھیں غرارے یا تنگ پائجامے میں ملبوس شال اوڑھے، ایک تمدن کی رکھوالی سی کرتی ہوئی۔ وہ بڑی دوستانہ اور دلچسپ گفتگو کرتی تھیں۔ میں نے ۷۹ء میں جنوری تا مارچ ان کے پڑوس ہی میں قیام کیا۔ رات کو اسی کمرے میں محفل جمتی۔ صالحہ باجی کی ایسی روشن دماغ اور متوازن خیالات کی مالک خواتین اب بہت کم نظر آتی ہیں۔ غالباً روح عصر شخصیتوں کی تشکیل کرتی ہے۔ سرسیّد اور مولانا حالی والی روح عصر کئی نسلوں تک کارفرما رہی۔ اسی نے میری والدہ اور ان کی معاصرین کو پیدا کیا تھا۔ صالحہ عابد حسین شائستہ اکرام اللہ اور انیس قدوائی کی پیڑھی سے تعلق رکھتی تھیں (موجودہ روح عصر چونکہ ناگفتہ بہ ہے اس کی نمائندگان کی فہرست گنوانا مناسب نہ ہوگا۔)

۱۹۷۹ء کی ان سردیوں میں اکثر بیگم انیس قدوائی بھی ٹہلتی ہوئی عابد ولا آجاتیں۔ ان دونوں خواتین کی بات چیت حیرت انگیز تھی۔ شاہ ولی اللہ، کارل مارکس، گاندھی جی۔ اکبر الہ آبادی۔ اقبال۔ غالب۔ ریاست دینی معاملات اردو ادب (جس کے مسائل بھی دینی مسائل کی طرح کافی ادق ہو چکے ہیں۔) اس وقت مجھے خیال آتا کہ ان دونوں نے کسی یونی ورسٹی میں نہیں پڑھا کوئی ڈاکٹریٹ حاصل نہیں کیے۔ محض اپنی ذہنی صلاحیت ذوق وشوق اور اپنے اپنے گھرانوں کی روایات کی بنا پر۔ یہ کتنی باخبر اور وسیع المطالعہ خواتین ہیں۔ اس طرح ان سے ذرا سینیئر خاتون یعنی میری والدہ جب باتوں باتوں میں اچانک بوئر وار کے جنرل بُوتھا یا عہد شاہجہانی کی خصوصیات کا تذکرہ کر جاتی تھیں تو سننے والے متعجب ہوتے تھے۔ اور یہ تینوں خشک مزاج تقریریں کرنے اور HOLIER-THAN THOU قسم کا رویہ رکھنے والی لیڈر خواتین نہیں تھیں۔ شدید حسِ مزاح کی مالک تھیں۔ (انیس باجی مرحومہ اس قسم کے مضامین لکھتی تھیں کہ "کیا مولانا آزاد کبھی بچہ تھے؟" بحیثیت مزاح نگار وہ اردو میں جس مرتبے کی مستحق تھیں وہ آج تک ان کو نہیں دیا گیا۔ طنز و مزاح کے متعلق "عالمی" سیمیناروں میں کوئی ان کا نام تک نہیں لیتا۔) اس حس ظرافت کی ایک وجہ یہ بھی تھی یہ بیگمات اپنی ذات سے عقیدت نہیں رکھتی تھیں۔ بلکہ دوسروں کے لیے دردمندی کا رویہ ان کے ہاں غالب تھا۔ اپنی اہمیت کے شدید احساس کی وجہ سے لامحالہ آپ کے مزاج میں ایک نوع کی سختی اور خشکی آجائے گی۔

یہ دونوں بحد صبر اور تحمل والی خواتین تھیں ان دونوں کو میں نے کبھی برہم اور برافروختہ نہیں دیکھا کسی بحث کے دوران بھی انھوں نے ایسے الفاظ استعمال نہیں کیے جن سے دلآزاری کا پہلو نکلتا ہو۔ اعلا تمدن کی یہی پہچان بھی ہے۔

ان دونوں کی روایت کی ایک اور خاتون بیگم آصفہ مجیب بھی جامعہ کے کیمپس پر عرصے سے سکونت پذیر تھیں۔

ان ہی دنوں ایک اردو اخبار میں علامہ اقبال کی ذات پات کے متعلق ایک بحث چھڑ گئی۔ ہمارے ہاں لوگوں کے پاس اس قسم کے مباحث کے لیے بہت فرصت

ہے مولانا محمد علی جوہر رامپوری تھے یا امروہوی یا نگینوی۔ علامہ اقبال کی اصل کاسٹ کیا تھی؟ وغیرہ۔ صالحہ باجی اور انیس باجی نے مجھ سے کہا دیکھو بی اس کے جواب میں ایک مضمون ہم لوگوں کی طرف سے جانا چاہیے چنانچہ وہ مضمون چھپا۔

شام کی ان محفلوں کے دوران جوں ہی اذان کی آواز آتی انیس باجی نماز پڑھنے کے لیے اپنے گھر روانہ ہو جاتیں۔ صالحہ باجی اپنے کمرے کا رخ کرتیں۔

ایران کے متعلق میرا رپورتاژ بعنوان کوہ دماوند اردو بلٹز میں ہفتہ وار چھپنا شروع ہوا۔ حکیم میرن صاحب نے سات اشعار قلم بند کیے۔

پڑھتا ہوں بہت شوق سے میں "کوہ دماوند"
افسوس کہ قسطوں میں ابھی ہے وہ نظر بند
طے جلد کتابت کی طباعت کی ہو منزل
چھپ کر یہ کتاب آئے تو پڑھ کر ہوں میں خورسند
ہوں منتظر وقت کہ جلد آئے وہ ساعت
اللہ رکھے خیر میں لاؤں گا قلاقند
خود بعد میں، عینی کو کھلاؤں گا میں پہلے
بھابی کو ذرا سی، وہ ہیں پرہیز کی پابند

کیا عجیب بات ہے کہ عابد ولا کا وہ خوشگوار منظر ہی معدوم ہو گیا۔ حکیم میرن صاحب بھی چلے گئے اور چار سال بعد ان کی بھابی بھی۔

صالحہ باجی کی صحت عرصے سے اچھی نہیں تھی لیکن وہ اپنے اوقات کی اسی طرح پابند رہتی تھیں۔ پنج وقتہ نماز صبح کو اپنی اسٹڈی میں علمی وادبی کام شام کو چہل قدمی ٹھیک آٹھ بجے شام طعام شب ان کی مجالس محرم بھی روائتی ڈھنگ کی نہیں تھیں۔ اور ان میں ہر فرقے اور مذہب کی خواتین جوق در جوق شریک ہوتیں۔ محافل میلاد النبیؐ اور مجالس محرم میں سیرتِ رسول کریمؐ اور سیرت حسینؑ پر بصیرت افروز تقاریر پر وہ خود کرتی تھیں۔ ایک بار میں نے ان سے کہا "ہماری اماں تو ایک قسم کی وہابی شیعہ تھیں۔" صالحہ باجی نے تصحیح کی "بخاری شیعہ کہو۔"

۱۹۸۴ء میں میں ذاکر باغ دہلی آگئی ان سے اکثر ملنا ہوتا رہا۔ "ہم لوگ" کا سیریل چل رہا تھا۔ محرّم کا زمانہ آیا۔ میں نے ان سے کہا۔ صالحہ باجی آپ سے ایک فتویٰ لینا ہے۔ "ہم لوگ" کی اگلی کڑی عین ساتویں تاریخ کو پڑ رہی ہے بطور ایک سماجی دستاویز دیکھ لیں؟ بہت ہنسیں۔

مذہبی رواداری اور امن پسندی ان پر ختم تھی۔ تصنع اور ملمع ان کے ہاں نہیں تھا۔ کیونکہ وہ سماجی مراتب، ظاہری ٹیپ ٹاپ وغیرہ سے اس وجہ سے متاثر نہ ہوسکتی تھیں کہ ان لوگوں کا فلسفہ حیات ہی جداگانہ تھا۔

صالحہ باجی کی آخری علالت سے چند روز قبل ہی میں نے ان سے کہا آپ کی اسٹڈی کے سامنے اتنے اچھے پھول کھلے ہیں بس حجاب امتیاز علی والی ایک بلبل ہارسنگھار کی ٹہنی پر بیٹھنا باقی ہے۔ کہنے لگیں تم کو تعجب ہوگا ایک بلبل بھی اکثر یہاں آجاتی ہے۔

کچھ عرصے بعد ان کی طبیعت ناساز ہوئی۔ وہ پہلو کے برآمدے میں دھوپ میں بیٹھی ڈاک دیکھ رہی تھیں۔ صحن کی کیاریوں میں نہایت خوشرنگ گلاب کھلے ہوئے تھے۔ میں نے کہا مجھے آپ کا یہ آنگن اور اس کا گھریلو ماحول بہت پسند ہے۔ کہنے لگیں یہ آنگن ہر صاحب ذوق کو پسند آتا ہے!

چند دن بعد ہی وہ صاحب فراش ہوئیں میں عیادت کے لیے گئی ان سے کہا آپ کا یہ معمولی ساز کام قطعی کوئی سنسنی خیز چیز نہیں ہے۔ حسب عادت کوئی شگفتہ جواب دینے کے بجائے خاموش رہیں۔ مجھے احساس نہ ہوا کہ وہ دنیا سے دل اٹھا چکی ہیں۔

ان کے جنازے میں شرکت کے لیے جو جم غفیر عابد ولا میں جمع ہوا اس میں وی۔ آئی۔ پی بھی شامل تھے اور عام لوگ بھی۔ اور ان میں سے بہت سے دلی صدمے کے آنسو بہا رہے تھے۔ ایک بوڑھا مسکین سفید ریش غریب آدمی پھاٹک کے پاس کھڑا زار و قطار رو رہا تھا۔

صالحہ باجی ساری عمر نہایت خاموشی کے ساتھ کتنے لوگوں کے کام آئیں اس کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتا کیونکہ اس پرانی روایت کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ کار خیر کی پبلسٹی نہیں کی جاتی تھی۔

پروفیسر شمیم حنفی

صالحہ آپا

۱۹۷۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے نسبت قائم ہوئی تو گرد و پیش کی بستی آبادی کا زیادہ تر حصہ میرے لیے اجنبی تھا۔ "عابد وِلا" پر اس وقت نام کی تختی نہیں لگی تھی۔ مگر اس احساس نے کہ یہ گھر عابد صاحب کا ہے، نہ صرف اس گھر کو بلکہ آس پاس کے علاقے کو میرے لیے اجنبی نہیں رہنے دیا۔ عابد صاحب کو علی گڑھ میں کئی بار دیکھا تھا۔ علی گڑھ میں ملازمت کے لیے انٹرویو ہوا تو بیرونی ایکسپرٹوں میں عابد صاحب بھی شامل تھے۔ عابد صاحب کی کتابوں کے واسطے سے بھی ایک تعلق بن چکا تھا۔ جامعہ آنے کے شاید اگلے روز ہی عابد ولا جانا ہوا۔ اس گھر کے مکینوں میں بیگم صالحہ عابد حسین اور ڈاکٹر صغرا مہدی، دونوں سے پہلی ہی ملاقات یوں ہوئی جیسے ایک دوسرے کو ہم بہت دنوں سے جانتے ہیں۔ یوں صالحہ آپا کو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا، علی گڑھ میں انیس پر ایک مذاکرے میں، مگر دور سے۔ صغرا سے وہ پہلی ملاقات تھی اور صالحہ آپا سے بھی روشناسی کے باوجود ملاقات کا وہ پہلا موقع تھا۔ ان کی آنکھوں میں تعلق کی چمک دیکھی تو خیال آیا کہ اس کا وسیلہ ہو سکتا ہے عابد صاحب ہوں کہ ان سے تعارف ہو چکا تھا۔ ویسے میں نے صالحہ آپا کی یادگار حالی زمانۂ طالب علمی میں پڑھی تھی۔ رسالوں میں آئے دن اُن کے مضامین، افسانے، خاکے چھپتے تھے اور سال دو سال پر کوئی نہ کوئی نئی کتاب۔ باضابطہ ملاقات اور تعارف کی رسم ادا ہوتی صالحہ آپا نے کہا:

"اچھا ہوا آپ جامعہ آگئے۔ عابد صاحب آپ کا ذکر کرتے رہتے تھے!"

مجھے یہ بات صرف اس لیے اچھی نہیں لگی کہ عابد صاحب کے ذہن میں میرا نام اور کچھ کام

اُردو اکادمی، دہلی
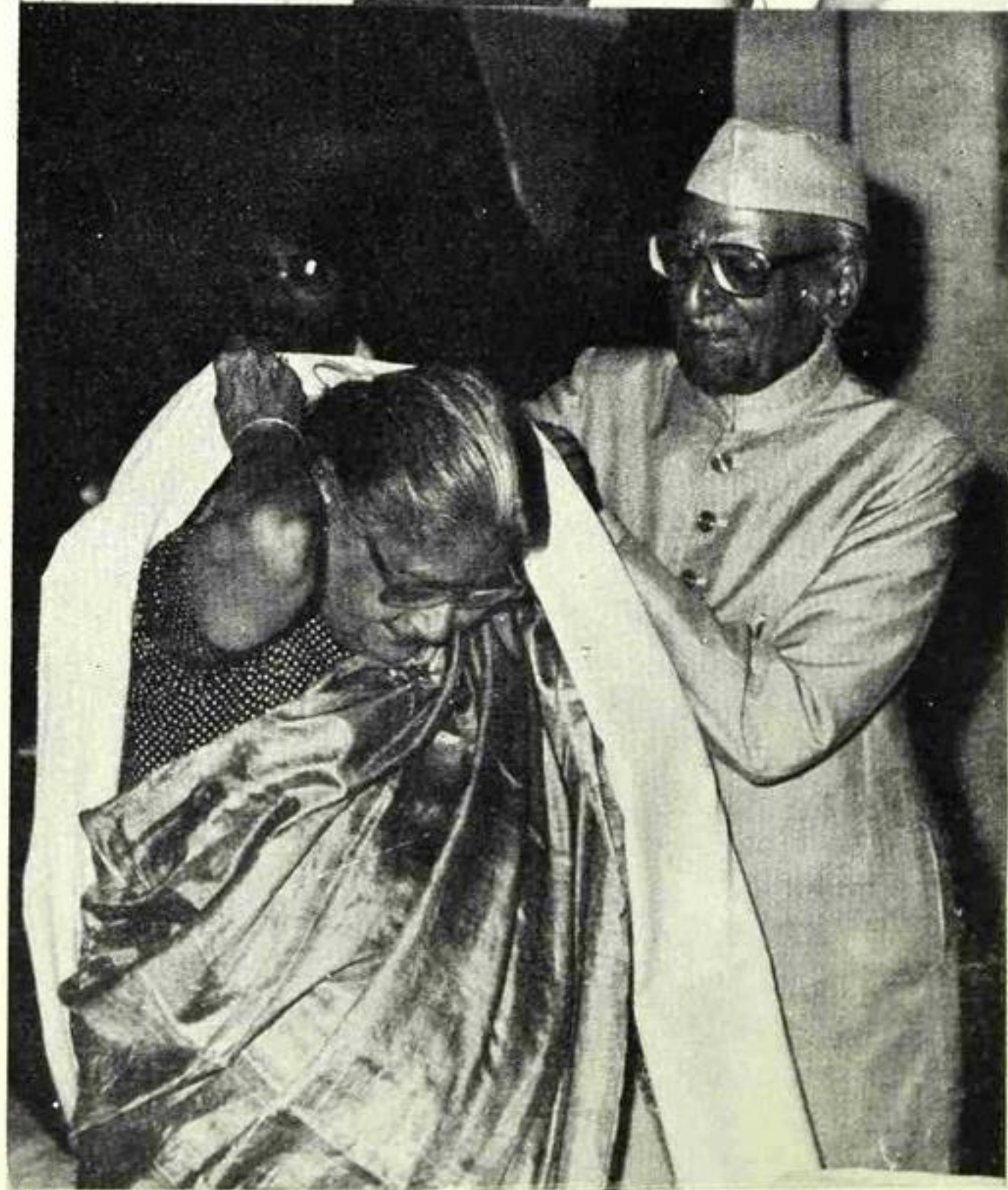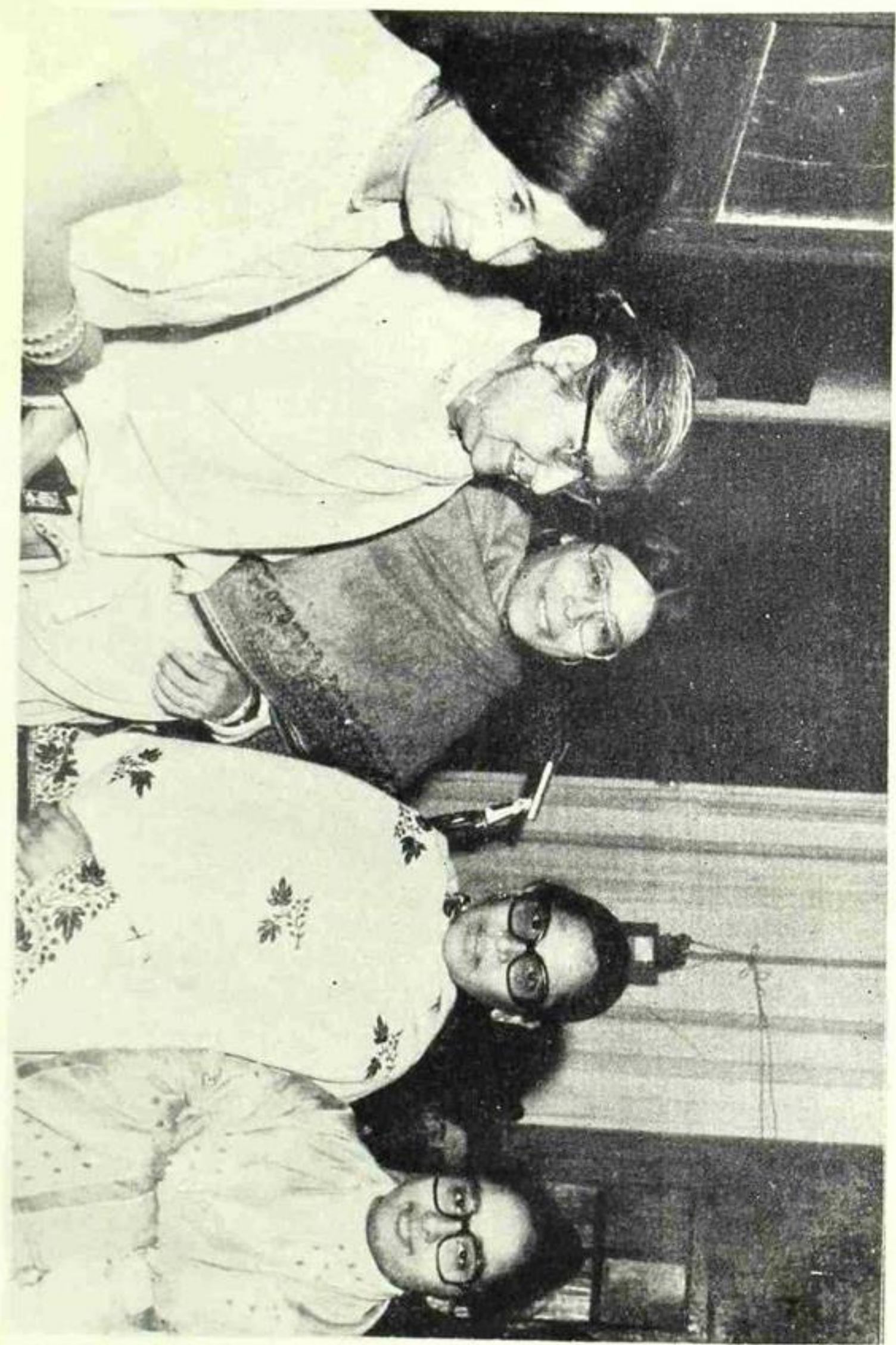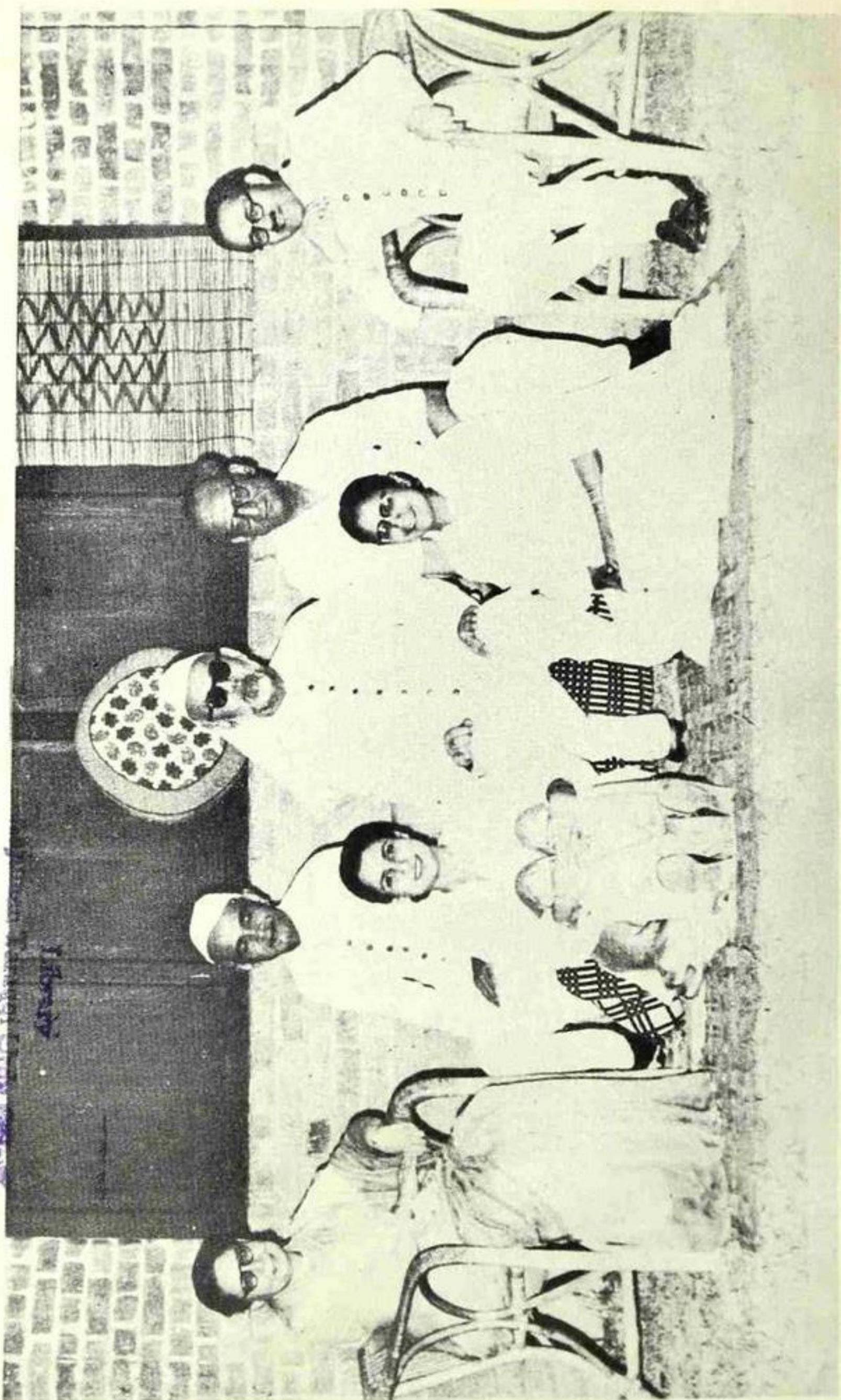
محفوظ رہ گیا تھا۔ یہ بات اس لیے بھی اچھی لگی کہ اس گھر کے مکین کسی نہ کسی سطح پر ایک دوسرے کی ذہنی زندگی میں بھی شریک تھے۔ اس واقعے سے کچھ ہی عرصہ پہلے عابد صاحب نے میرے ڈی۔ لٹ کے مقالے کی رپورٹ علی گڑھ یونی ورسٹی کو بھیجی تھی۔ صالحہ آپا نے ملتے ہی یہ بھی بتا دیا کہ عابد صاحب کو مقالہ پسند آیا تھا اور انھوں نے صالحہ آپا کو مقالہ دکھایا بھی تھا۔ بہت سے تعلیم یافتہ گھرانوں میں ایک بات جو اکثر تجربے میں آئی، یہ ہے کہ اس گھرانے کے افراد میں آپسی رشتوں کی نوعیتیں بالعموم محدود ہوتی ہیں۔ عابد ولا کا معاملہ الگ نظر آیا۔ ہر چند کہ صالحہ آپا کی تحریروں کا مزاج عابد صاحب سے یکسر مختلف تھا، لیکن محسوس یہ ہوا کہ دونوں ایک دوسرے کے علمی اور ادبی مشغلوں، عام دلچسپیوں اور ایک دوسرے کی سوچ پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔

اس کے بعد میرا معمول یہ بن گیا کہ مہینے میں کم سے کم دو بار عابد ولا ضرور جاتا تھا۔ عابد صاحب کے ساتھ ساتھ صالحہ آپا اور صغرا سے بھی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ پھر اتفاق ایسا ہوا کہ ہم عابد ولا سے ملحق، خواجہ غلام السیدین مرحوم کے بسیرے میں اٹھ آئے۔ عابد ولا میں اور ہمارے اس نئے ٹھکانے میں تعلق گھر آنگن کا تھا۔ صالحہ آپا کو قریب سے دیکھنے، تقریباً ہر دوسرے تیسرے روز اُن سے ملنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ضرور نکل آتا تھا۔ ملاقات نہ ہو، جب بھی گل مہر ایونیو کی سڑک پر ہر شام، عابد ولا سے ٹیچرز ٹریننگ کالج تک چہل قدمی کرتی ہوئی صالحہ آپا نظر آجاتی تھیں۔

اُن کی زندگی میں نظم و ضبط بہت تھا اور ایک ایسی وضع داری جس کا اجالا شخصیت کے باطن سے پھوٹتا ہے اور ہستی کے تمام گوشوں کے گرد پھیل جاتا ہے۔ روز مرّہ زندگی کے معمولات جس طرح مقرر تھے، اسی طرح صالحہ آپا کے لکھنے پڑھنے کا وقت، جگہ، طور طریقہ بھی مقرر تھا۔ شاید اسی لیے، اپنی بیماریوں اور گھریلو ذمّے داریوں کے باوجود انھوں نے تصنیف، تدوین اور تحقیق، ہر میدان میں جتنا کام کرنا چاہا کر ڈالا۔ اس معاملے میں عابد صاحب کے مزاج کا نظم و ضبط اور قرینہ مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنی آخری بیماری کے زمانے میں بھی انھوں نے آگے کے کاموں کا ایک بہت بڑا منصوبہ بنا رکھا تھا اور بیماری کے ساتھ ساتھ اس منصوبے سے متعلق جو کچھ وہ کر سکتے تھے۔ کرتے رہتے تھے میں نے کبھی بھی انھیں وقت کی کمی کا گلہ شکوہ کرتے ہوتے ہوئے نہیں دیکھا، عابد صاحب کی عام شخصیت میں جو ٹھہراو تھا۔ وہی ٹھہراو ان کے ذہنی اور علمی مشاغل سے بھی ظاہر ہوتا تھا۔ عجلت میں بھی کام وہ اطمینان سے کرتے تھے۔ صالحہ آپا کا انداز یہ تھا کہ وہ تیز لکھتی تھیں، اپنے کاموں کو جلد سے جلد نپٹانے کی فکر کرتی تھیں لیکن صبح سے شام

تک، ان کے معمولات کا نظام کبھی بکھرتا نہیں تھا۔

ہماری خواتین میں شعر اور افسانہ لکھنے کی روش تو خاصی پرانی اور عام ہے۔ لیکن شعر اور افسانہ لکھنے والیوں میں علمی کاموں سے انہماک کی مثالیں بہت زیادہ نہیں ہیں۔ صالحہ آپا نے بچوّں کے لیے، بڑوں کے لیے، کہانیوں، ناولوں اور ڈراموں کے علاوہ بھی کئی کتابیں لکھیں اور ترتیب دی ہیں۔ جو وسعت ان کتابوں کے موضوعات میں ہے، وہی اُن کی فکر اور شخصیت میں بھی تھی۔ وہی اُن کی فکر، سماجی مسائل، تہذیبی اور معاشرتی مسائل، ادبی اور تعلیمی مسائل، صالحہ آپا نے کسی کا دروازہ اپنے آپ پر بند نہیں ہونے دیا۔ ہرچند کہ اُن کی اپنی تعلیم روایتی خطوط پر ہوئی تھی، لیکن گھر کے ماحول اور عابد صاحب کے اثر سے قطع نظر، خود اپنی داخلی طلب کے نتیجے میں انھوں نے علم اور اکتساب کے اُن میدانوں کی سیر بھی کی جو ہمارے جدید علوم اور افکار سے نسبت رکھتے ہیں۔ بیگم انیس قدوائی مرحومہ کی زندگی کے آخری چند برسوں میں، اکثر اُنھیں اور صالحہ آپا کو آپس میں محوِ گفتگو دیکھا۔ خواتین کے مرغوب موضوعات سے صالحہ آپا بیزار نہیں تھیں، لیکن معاشرتی، سماجی، تہذیبی، تعلیمی، مذہبی مسئلوں پر بیگم انیس قدوائی اور صالحہ آپا کی بات چیت کئی بار میرے مشاہدے میں آئی۔ اب کہ دونوں رخصت ہو چکی ہیں۔ خیال آتا ہے کہ مسلم خواتین کی نشاۃ ثانیہ کا یہ اسلوب جس کی نمایندگی صالحہ آپا اور بیگم انیس قدوائی کرتی تھیں، اب دھیما پڑتا جارہا ہے۔ اس کی جگہ اب نئے اسالیب نے لے لی ہے، مگر وہ جو نئے اور پرانے کا ایک انوکھا امتزاج تھا، اس کا رنگ اب رخصت ہوا۔

اسی لیے، بار بار یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ صالحہ آپا کی شخصیت سے جس تہذیبی، روایتی اور فکری سانچے کی نشاندہی ہوتی تھی۔ اب وہ سانچہ ٹوٹ چکا ہے۔ اپنی مشرقیت، اپنی تاریخ، اپنے عقیدت اور ایقان اور روایت کی پوری حفاظت کے ساتھ نئے افکار اور اسالیب حیات کو قبول کرنے، دونوں کو یکساں اعتماد اور احتیاط کے ساتھ قابو میں رکھنے کے وہ آداب اب مٹتے جاتے ہیں۔ صالحہ آپا اپنے تہذیبی، معاشرتی اور روایتی پس منظر سے کبھی الگ نہیں ہوئیں۔ لیکن نئے سوالوں اور نئی سچائیوں کو پرکھنے اور سمجھنے اور برتنے کا حوصلہ بھی ان میں ہمیشہ موجود رہا۔ وہ ایک ساتھ اپنے ماضی میں بھی رہتی تھیں اور اپنے حال میں بھی۔ تسلسل کی اس ڈور کو سنبھالنے کے لیے نئے اور پرانے کے تصادمات سے خود کو اوپر اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر دور کی بہ نسبت ہمارے اپنے دور میں یہ کام آسان تر ہے کہ ہماری اجتماعی سائکی میں ماضی اور تاریخ کا احساس

اب پہلے جیسا نہیں رہا۔ لیکن صالحہ آپا جس ماضی کی ترجمان تھیں۔ اس میں اور صالحہ آپا کے حال میں کبھی کوئی ٹکراؤ نہیں ہوا۔ نہ تو ان کی مذہبیت نے اُن کی روشن خیالی کے اظہار میں رکاوٹ ڈالی، نہ ماضی سے اُن کی وابستگی نے تہذیب اور معاشرے کے نئے مظاہر سے اُن کی دلچسپی میں کمی آنے دی۔

انتقال سے کچھ ہی پہلے صالحہ آپا نے جامعہ کی بستی کے پرانے اور نئے رنگوں کی روداد اپنے مخصوص رواں دواں انداز میں غالباً "جامعہ کل اور آج" کے عنوان سے ترتیب دی تھی۔ اس روداد کو دیکھ کر یہ تاثر صاف ابھرتا تھا کہ تبدیلیوں کی رفتار میں جو تیزی آئی ہے، اس پر وہ افسردہ اور ملول ہیں۔ یہ افسردگی اور ملال ایک واضح اخلاقی احساس رکھتا تھا۔ تبدیلی جب اقدار اور اسالیب حیات کے بنے بنائے نظام میں ابتری اور انتشار کا بہانہ بن جائے تو اس سے پریشان ہونا فطری ہے۔ سو، صالحہ آپا بھی پریشان ہوئیں۔ اب کہ وہ نہیں ہیں اور تبدیلی میں زوال کا وہ سلسلہ تیز تر ہوتا جاتا ہے، تو بار بار خیال آتا ہے کہ پریشان ہونا اس نوع کے اجتماعی مسئلوں کا علاج نہ سہی، مگر وہ دنیا کتنی بدنصیب ہوگی اور وہ معاشرہ کتنا بے توفیق جب اجتماعی زندگی میں پستی اور انحطاط کا کوئی بھی مظہر ہمیں پریشان رکھنے کی طاقت سے خالی ہو جائے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو صالحہ آپا کی شخصیت بھی ہمارے معاشرتی سیاق میں ایک دفاعی مورچے کی طرح تھی۔ افسوس کہ تہذیب اور روایت کے سانچے ٹوٹتے ہیں تو ہر معاشرے کا دفاعی مورچہ بھی کمزور پڑتا جاتا ہے۔

پروفیسر عنوان چشتی

صالحہ عابد حسین سے ایک ملاقات

صالحہ عابد حسین اُردو دنیا کی ممتاز قلم کار ہیں۔ انھوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز افسانوی ادب سے کیا۔ لیکن علمی، تنقیدی اور تحقیقی میدان میں بھی امتیاز حاصل کیا۔ وہ اُردو کی بے لوث انتھک ادیبہ ہیں۔ صلہ و ستایش سے بے نیاز ہو کر، تقریباً نصف صدی سے اُردو زبان و ادب کی مشاطگی میں مصروف ہیں۔ جو سادگی، خلوص اور دردمندی اُن کی شخصیت کا جوہر ہے، وہی اُن کے تخلیقی اور تنقیدی شہ پاروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اُن کی تحریروں میں اسلامی افکار کا حُسن، مشترکہ تہذیبی انداز کی طاقت، سماجی بصیرت اور ذاتی تجربوں کا رنگ شامل ہے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جن سے صالحہ عابد حسین کے فنکار کا تار و پوُد تیار ہوا ہے۔

صالحہ باجی کا سادہ پُرکار ڈرائنگ روم ہے، جس میں جنوب مغرب کی شیشے کی دیواروں سے روشنی چھَن چھَن کر آ رہی ہے۔ سامنے صوفے پر صالحہ باجی پُروقار انداز میں بیٹھی ہیں۔ اور میں اُن کی شخصیت اور فن کے بعض اہم گوشوں تک رسائی کے لیے پہلا سوال کرتا ہوں۔

س :۔ صالحہ باجی، آپ کے ذہن و افکار کو سمجھنے کے لیے میں سب سے پہلے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے کن فنکاروں اور کتابوں کا سب سے زیادہ اثر قبول کیا ہے؟

ج :۔ بچپن اور نوعمری میں جو کتابیں بھی پڑھی جائیں انسان سبھی کا تھوڑا بہت اثر قبول کرتا ہے۔ میں نے قرآنِ پاک اور اسلامی تعلیمات کا اثر زیادہ قبول کیا ہے۔ میں نے قرآن پاک کو ترجمے کی مدد سے پڑھا ہے۔ خاص طور پر مولانا

ابوالکلام آزاد کا ترجمان القرآن اور تفسیرِ سورۂ فاتحہ کا مطالعہ کیا ہے۔ اور بار بار آنحضرت صلعم کی سیرتِ پاک اور آئمہ معصومین کے سوانح حیات کو پڑھا۔ لیکن میں نے اسلام کا مطالعہ کرنے کے ساتھ، دوسرے مذاہب سے بھی واقفیت پیدا کرنے کی کوشش کی اور تھوڑی بہت معلومات حاصل کیں جس سے مجھے مختلف مذاہب کی رُوح کو سمجھنے میں مدد ملی۔ اس کا یہ اثر ضرور ہوا کہ میں مذہبی کٹرپن اور تنگ نظری سے دُور ہوگئی اور میرے ذہن میں ہر مذہب کی بُنیادی اقدار اور اُن کے بانیوں کا احترام پیدا ہوگیا۔ شاید اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ میرے خاندان میں بے تعصبی کی مضبوط روایات رہی ہیں۔

س :۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آپ کے خاندان میں شیعہ سُنّی کا کوئی تفرقہ نہیں۔ اور خاندان میں دونوں عقیدوں کو ماننے والے افراد موجود ہیں۔

ج :۔ عنوان صاحب، یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ مولانا الطاف حسین حالی میرے پرنانا تھے۔ اور وہ سنّی تھے۔ میرے نانا خواجہ اخلاق حسین صاحب بھی سُنّی تھے۔ مگر ان دونوں کی بیویاں شیعہ تھیں۔ خاندان میں غیر رسمی طور پر یہ سمجھوتہ تھا کہ لڑکے باپ کے مذہب پر اور لڑکیاں ماں کے مذہب پر ہوں۔ چنانچہ گھر میں سب لوگ اپنے اپنے عقیدوں پر رہ کر مطمئن اور مسرور زندگی گزارتے تھے اور اب بھی گزارتے ہیں۔

س :۔ مذہبی کتابوں کے علاوہ آپ نے کن خاص ادبی کتابوں اور مصنّفوں کا مطالعہ کیا اور اثرات قبول کیے۔

ج :۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ میرا خاندان علمی و ادبی دنیا میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔ آنکھ کھولتے ہی گھر میں اچھی لائبریری دیکھی۔ خواتین کے ناولوں سے لے کر نذیر احمد کے ناولوں تک اور شرر اور سرشار سے لے کر پریم چند تک سبھی کو پڑھا۔ مگر شاید گہرا اثر پریم چند ہی کا قبول کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد، نذیر احمد، حالی اور شبلی کو بطورِ خاص پڑھا۔ شاعروں میں انیس، غالب، حالی اور اقبال میرے محبوب شاعر ہیں۔ انیس اور حالی پر تو میری مستقل تصانیف ہیں۔ اُردو مصنّفین کے علاوہ ٹیگور اور سرت چندر کے جتنے ناول اُردو یا انگریزی کے ترجموں کے ذریعے پڑھ سکتی تھی،

پڑھے۔ میں ان سے بہت متاثر ہوں۔ میرا خیال ہے کہ بنگالیوں کو کہانی کہنے کا جتنا سلیقہ ہے، شاید اور کسی کو نہیں۔ میں نے اُردو کے کلاسیکی ادب کے علاوہ انگریزی کے کلاسیکی ناول بھی پڑھے ہیں۔ ترجمہ کے ذریعے گورکی اور ٹالسٹائی کو بھی پڑھا۔ فرانسیسی ناول بھی پڑھے۔ ابسن، برنارڈ شا اور دوسرے انگلش ڈراما نگاروں کے ڈرامے بھی شوق سے پڑھتی ہوں۔ مگر میں یہاں یہ بات واضح طور پر کہنا چاہتی ہوں کہ میں نے یوں تو اُردو کے سارے سرمایے کو سرسری نظر سے دیکھا ہے اور جیسا کہ میں نے کہا، بعض کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ مگر میں نے شعوری طور پر کسی ادیب کی تقلید نہیں کی۔ میرا مطالعہ میری شخصیت کا جزو بنتا رہا۔ اس کا اثر کہاں تک میری تحریروں میں جھلکتا ہے اس کی تلاش اور نشان دہی میرے نقاد کا کام ہے۔

س :۔ آپ کی ذاتی یعنی غیر ادبی دلچسپیاں کیا ہیں؟ آپ لکھنے پڑھنے کے علاوہ اپنا وقت کس طرح گزارتی ہیں؟

ج :۔ بھئی کیا تھیں کہنے تو مناسب تھا کہ عمر اور صحت کی اس منزل میں جب رختِ سفر تقریباً ہر وقت بندھا رہتا ہے، دلچسپیاں بھی محدود ہو گئی ہیں۔ یعنی گھریلو ذمہ داریاں، اپنے بچوں کی تعلیم یا نوکری یا شادی کی فکر۔ اپنے شوہر (ڈاکٹر سید عابد حسین) کی خدمت و رفاقت کے علاوہ اب تو بس لکھنے پڑھنے کا شوق ہی رہ گیا ہے، یا مذہبی مطالعے یا عبادت کا شوق۔ جو بالکل ذاتی چیز ہے۔ ہاں چند سال پہلے تک بہت سی چیزوں سے دلچسپی لیتی تھی۔ میں نے سینے پرونے، کاڑھنے بُننے اور مختلف قسم کی دست کاریاں سیکھی تھیں۔ مجھے باغبانی کا شوق رہا ہے۔ اگرچہ وسائل کی کمی اور صحت کی خرابی کی وجہ سے اس شوق کو پورا کرنے کے موقعے کم ملے ہیں۔ آپ کو شاید یہ سُن کر تعجّب ہو کہ میں نے بارہ پندرہ سال تک فوٹو گرافی بھی کی ہے خاندان اور دوستوں میں شاید ہی کوئی ہو، جس کی متعدد تصویریں نہ لی ہوں۔ مناظرِ فطرت سے مجھے ہمیشہ سے عشق ہے۔ اسی لیے میں نے یہ فن سیکھا بھی تھا۔ آٹھ سال تک کشمیر کے ہر ہر قابلِ ذکر حصّے کی تصویریں کھینچیں۔ آگرہ، میسور، بنگلور، دلّی وغیرہ کی قابلِ دید عمارات اور مناظر کو قید کیا ہے اور یورپ کے جن جن ملکوں میں گئی وہاں کی بہت سی تصویریں لی ہیں۔

مگر شوق تھا بہت مہنگا اور آمدنی تھی بہت محدود۔ اور پھر آپ جانیں کہ جس طرح کتاب لکھو، چھپواؤ اور پھر لوگوں کی خدمت میں تحفہ پیش کرو، بالکل یہی حال تصویروں کا تھا۔ اس لیے اس شوق کو چھوڑ دیا۔ ایک زمانے میں کوئی آٹھ سال تک ہومیوپیتھک دواؤں سے غریب بچوں اور عورتوں وغیرہ کا علاج کرنے کا مرض بھی لاحق ہو گیا تھا مگر خدا کا شکر کہ اس سے بھی شفا ہو گئی مجھے ایک شوق اپنے گھر کو بنانے سنوارنے کا رہا ہے اور وہ اب تک ہے۔ کم قیمت اور معمولی چیزوں سے کس طرح اپنے ذوق کے مطابق گھر کو سجایا سنوارا جاتا ہے، اس کی عمر بھر کوشش کی اور اب بھی کرتی ہوں۔ اور ہاں لیجیے یہ تو رہ ہی گیا کہ مجھے فلم دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ اچھی فلم، معیاری فلم۔ اور یہ شوق اب تک باقی ہے۔ میرے شوہر کو حیرت ہوتی ہے کہ میں اتنی پریشانی اٹھا کر بھی فلم دیکھنے جاتی ہوں۔

س :۔ میں آپ سے ایک نہایت حساس سوال کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ وہ یہ کہ آپ نے اولاد کی محرومی کے خلا کو کس طرح محسوس کیا ہے اور اپنی مامتا کے جذبے کو کس طرح تشفی دی ہے۔ کیا اس کا کوئی اثر آپ کے فکر و فن پر بھی ہوا ہے۔ اگر ہوا ہے تو کیا؟

ج :۔ عنوان صاحب، یہ ایک ایسا موضوع ہے جسے چھیڑنے کی ہمت نہ آج تک کسی نے مجھ سے کی اور نہ میں ہی اس درد کو لفظوں میں بیان کرنے کی طاقت رکھتی ہوں۔ اب آپ نے پوچھا ہے تو اتنا کہہ دوں کہ اس کی بدولت میں نے بڑی نعمتیں پائی ہیں۔ ہر بچہ میری محبت کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ خاندان اور دوستوں کے بچے میری محبت کا مرکز رہے ہیں۔ ان سب کو میں نے اپنا سمجھا ہے اور ان میں سے بہت سوں نے مجھے اپنا جانا۔ دل کے خلا کو پُر کرنے کے لیے اتنے بچوں کی ممتا کیا کم ہے۔ رہا فکر و فن پر اس کا اثر۔ وہ پڑھنے والے خود محسوس کر سکتے ہیں۔ شاید کبھی کبھی غمِ دوراں بیان کرتے کرتے غمِ جاناں کی جھلک آجاتی ہے۔ میں نے اپنے درد ہی سے دوسروں کا درد سمجھا اور محسوس کیا ہے۔ میرے ناول اور افسانوں میں بہت سی ممتا کی ماری ماؤں کا دکھ آپ کو ملے گا۔ اکثر میرے معصوم قاری یہ سمجھ لیتے ہیں کہ

یہ میری آپ بیتیاں ہیں۔ نہیں عنوان صاحب، یہ زیادہ تر میری اُن بہنوں کی مجروح تمنا کی پُکار ہے جو اس منزل سے گزری ہیں۔ ہاں فن میں احساسات و جذبات کا رنگ فنکار کا حساس دل بھرتا ہے۔ جس پر یہ بیتی نہ ہو، کیسے سچی عکاسی کر سکتا ہے اس دردِ عظیم کی۔ بس اس بارے میں اور کچھ نہ کہہ سکوں گی۔

س:۔ میں نے موقع کی نزاکت کو دیکھ کر سوال کا رُخ پھیرتے ہوئے پوچھا باجی، مجھے یہ جاننے کا شوق ہے کہ آپ نے کب لکھنا شروع کیا ذرا اپنی ابتدائی ادبی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیے۔

ج:۔ میں نے بہت کم سنی سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ غالباً ۹ برس کی ہوں گی جب باقاعدہ لکھنا شروع کر دیا تھا۔ میرے ابتدائی مضامین "تہذیب نسواں" اور "پھول" میں شائع ہوتے تھے۔ مگر میں نے اپنا پہلا ناول سولہ سال کی عمر میں یعنی ۱۹۲۹ء میں لکھا تھا جس کا نام "حُسنِ اتفاق" تھا مگر یہ ناول ظاہر ہے کہ بہت بچکانہ تھا اس لیے میں نے کبھی اسے شائع کرانے کا خیال نہیں کیا۔ اس کے بعد سے مسلسل لکھ رہی ہوں۔ میرا پہلا افسانہ ۱۹۲۸ء میں "نور جہاں" میں شائع ہوا تھا اور پہلا ناول "عذرا" ۱۹۴۲ء میں۔ میں نے ریڈیو پر ۱۹۳۶ء میں بولنا شروع کر دیا تھا اور تب سے اب تک سیکڑوں تقریریں، افسانے اور فیچر نشر ہو چکے ہیں۔ ابتدائی ریڈیو تقریریں "بات چیت" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔

س:۔ آپ نے کس کس موضوع پر علمی کام کیا ہے اور افسانوی ادب کا کینوس کیا ہے؟

ج:۔ عنوان صاحب علمی کام تو بہت بڑا لفظ ہے۔ یوں تو میں نے بہت سی ریڈیو تقریریں ادبی، سیاسی، معاشی، مذہبی، گھریلو اور عورتوں کے مسائل پر کی ہیں۔ ان کو تو آپ علمی کام کہیں گے نہیں، نہ میں سمجھتی ہوں۔ ہاں سب سے پہلے میں نے ۱۹۴۹ء میں مولانا حالیؔ پر ایک کتاب "یادگارِ حالیؔ" کے نام سے لکھی۔ جب انجمن ترقی اُردو (ہند) نے اُسے شائع کیا تو حسنِ اتفاق سے یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور کئی یونی ورسٹیوں میں اسے پڑھایا جانے لگا۔ اب تک اس کی چار اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے

کئی سال بعد میرے چند مضامین کا مجموعہ " ادبی جھلکیاں "، کے نام سے شائع ہوا تھا۔ انھیں بھی آپ ادبی کہیں گے علمی نہیں۔ تین سال پہلے میں نے سیدین صاحب کی نامکمل خودنوشت " مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں" کا دوسرا حصہ ذکرِ جمیل کے نام سے لکھا ہے۔ یہ ایک طرح سے سیدین صاحب کی مختصر سوانح حیات ہے۔ ایک ضخیم کتاب "خواتینِ کربلا کلام انیس کے آئینے میں" میری دس بارہ سال کی محنت کا ثمرہ ہے۔ آپ چاہیں اسے علمی کام کہیں یا تنقیدی۔ انیس پر ہی ایک دوسری کتاب "انیس سے تعارف" (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) شائع ہوا ہے۔ "جانے والوں کی یاد آتی ہے" میرے اُن مقالوں اور خاکوں کا مجموعہ ہے جو میں نے اپنے بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کی یاد میں لکھے ہیں۔ ہاں ایک کام کئی سال کی محنت سے میں نے ایسا کیا ہے، جسے علمی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی انیس کے مرثیوں کا انتخاب، مع حواشی، حوالوں، دیباچوں اور مقدمے کے اس کی پہلی جلد مکمل ہے جو زیرِ اشاعت ہے۔ دوسری زیرِ تکمیل ہے۔ ان دونوں جلدوں میں انیس کے ۵۴ بہترین مرثیوں کا انتخاب شامل ہے۔ انیس پر ایک اور کتاب بچوں کے لیے لکھ رہی ہوں، اور ہاں یاد آیا مولانا حالی پر بھی نوعمر بچوں اور بچیوں کے لیے نیشنل بک ٹرسٹ کی ایما پر ایک کتاب لکھی ہے۔ ویسے میں نے چھوٹی چھوٹی کتابوں کے انگریزی سے اُردو میں ترجمے بھی کیے ہیں۔ ایک کتاب حال ہی میں "مہاکوی انیس" کے نام سے ہندی میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں سچ مچ میں نے بہت محنت کی ہے۔ اسی کتاب میں وضاحتی نوٹ اور مفصل مقدمہ بھی شامل ہے۔ اس کتاب میں اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ ہندی پڑھنے والے بھی انیس کے محاسنِ کلام اور عظمت سے واقف ہو جائیں۔

س :۔ مختصراً آپ نے اپنے علمی، تنقیدی اور تحقیقی کاموں کے بارے میں بتا دیا ہے، اب اتنا اور بتا دیجیے کہ آپ کے افسانوی ادب کا کینوس کیا ہے؟

ج :۔ عنوان صاحب، میں نے لکھا تو اس سے بھی زیادہ ہے جو چھپا ہے۔ مگر آپ سے شائع شدہ چیزوں کا ہی ذکر کروں گی۔ اب تک میرے سات ناول اور ۵ افسانوں کے مجموعے (پانچواں زیرِ اشاعت ہے) شائع ہو چکے ہیں۔ تین چار کتابیں کم پڑھے

لکھے لوگوں کے لیے شائع ہو چکی ہیں۔ بچّوں کے لیے ڈرامے اور کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ ان میں دو ناول پانچ کہانیاں اور دو ادبی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ناولوں میں کوئی ایسا ناول نہیں جو تین چار سال کی مدّت سے کم میں لکھا گیا ہو۔ سوائے "اُلجھی ڈور" کے جو مختصر ہے اور دو ماہ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔

س :- آپ نے اتنا علمی و تخلیقی کام طبیعت کی ناسازی، خانگی و سماجی ذمہ داریوں کے باوجود کس طرح انجام دیا؟

ج :- عنوان صاحب یہ سوال تو میں اکثر خود اپنے آپ سے بھی کرتی ہوں۔ اس کی ایک صاف وجہ تو یہ ہے کہ سارے کام محض چند سال کی محنت کا نتیجہ نہیں، بلکہ ۴۰ سال قلم گھسنے کا نتیجہ ہیں۔ آپ ۳۸ سال کہہ لیجیے کہ میرا پہلا افسانوی مجموعہ "نقشِ اوّل" ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا۔ پھر اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ میں مُسلسل لکھتی رہی ہوں۔ بیماریاں، ذمہ داریاں، پریشانیاں اور غیر ادبی مصروفیتیں ان میں سے کوئی بھی میرے لکھنے پڑھنے کے ذوق کو ختم تو کیا کم کرنے میں بھی کامیاب نہ ہو سکیں۔ وقتی طور پر لکھنے اور پڑھنے کی رفتار سُست ضرور ہوئی ہے۔ کبھی کبھی چند دن یا چند ماہ ایسے ضرور آئے ہیں کہ کچھ نہیں لکھ پائی۔ یہ بہت کرب ناک وقت ہوتا ہے۔ مگر اس وقت کے گزر جانے پر زیادہ جوش کے ساتھ لکھتی ہوں۔ ایک وجہ اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ میں بہت تیز لکھتی ہوں۔ اتنا تیز کہ ٹائپ کرنے والے بھی پیچھے رہ سکتے ہیں۔ جو کچھ سوچنے، پلاٹ مرتب کرنے اور کرداروں کے تشکیل کرنے کا عمل ہوتا ہے، وہ میرا دماغ مہینوں تک کرتا رہتا ہے۔ جب نہیں لکھتی تو اس عرصے میں یہ تخلیقی یا ذہنی عمل اور زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن جب لکھتی ہوں تو الفاظ و خیالات دونوں میرے قلم کے زیرِ نگیں ہوتے ہیں۔ ایک بار میرے شوہر نے (جو بہت سُست لکھتے ہیں) میرے نانا خواجہ سجاد حسین (صاحب زادہ خواجہ حالی) سے کچھ شکایتاً کہا "اباجی مصداق بہت تیز لکھتی ہیں۔" وہ مسکرائے اور کہا "اس کے ہاں آمد ہے آورد نہیں۔" اس کا مطلب یہ نہ سمجھیے کہ میں اس کو کوئی بہت بڑی خوبی سمجھتی ہوں۔ اس طرح لکھنے پر میرے شوہر اور بھائی (خواجہ غلام السیدین صاحب) نے اتنا ٹوکا ہے کہ اب میں خود تنقیدی کے مرض میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ لکھنے کے بعد میں اپنی تحریر کو مختصر کرتی ہوں۔ زبان کی

نوک پلک درست کرتی ہوں۔ نیز لکھنا میری خاندانی خصوصیت بھی ہے۔ میرے والد، میرے بھائی، میرے کزن عباس ہم سب زود نویسی کے مارے ہوئے ہیں۔ اور اگر میں آپ کو یہ بتاؤں کہ مجھے اتنی ساری چیزیں خود ہی نقل کرنی ہوتی ہیں اور اگر یہ نہ ہوتا تو شاید میں اس سے دُگنا لکھتی۔ تو آپ کیا کہیں گے، شاید شکر کریں۔ میں بھی شکر کرتی ہوں بسیار نوسی کوئی خوبی تو نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کیسا لکھا ہے اور اس کا معیار کیا ہے۔ مجھے مسرت ہے کہ میرے پڑھنے والوں نے (پیشہ ور نقادوں اور بزعم خود بہترین ادیبوں کا ذکر نہیں) میری تخلیقات کو سراہا اور پسند کیا۔ اس کی آخری اور بڑی وجہ یہ ہے کہ لکھنا میری زندگی ہے، میری رُوح کی پکار ہے۔ میرے دل کا سکون اور راحت اسی میں پوشیدہ ہے۔

س :۔ چونکہ آپ نے اپنے تخلیقی عمل کے بارے میں بعض اشارے کر دیے ہیں اس لیے کیوں نہ میں اُن خاص کیفیات کے بارے میں پوچھ لوں جن سے آپ لکھتے وقت دوچار ہوتی ہیں۔

ج :۔ عنوان صاحب، آپ کا سوال بے حد پیچیدہ اور تفصیل طلب ہے۔ تخلیقی عمل سے اگر آپ کی یہ مراد ہے کہ شاعروں کی طرح مجھے "الہام" کیسے ہوتا ہے، تو جناب "الہام" ہمیں نہیں ہوتا۔ زندگی کی حقیقتوں کو دیکھنے اور بیان کرنے والا اس کا دعوا کر بھی نہیں سکتا۔ ہاں یہ ضرور کہوں گی کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی خاص واقعے نے مجھ پر اثر ڈالا اور میں نے اس کو فوراً لکھ دیا۔ مگر اکثر یہ ہوتا ہے کہ میرے افسانے خصوصاً ناول صفحۂ قرطاس پر آنے سے قبل مہینوں یا برسوں میرے ذہن میں پکتے رہتے ہیں۔ ابتدا میں اس کا ہیولیٰ میرے ذہن میں مبہم ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ واضح ہوتا جاتا ہے۔ یعنی ابتدا میں میں کسی چیز کو کچھ شعوری اور کچھ نیم شعوری طور پر محسوس کرتی ہوں۔ اس دوران سوچنے کا عمل جاری رہتا ہے اور اس کے خدوخال اُبھرتے رہتے ہیں۔ ایک خاص قسم کی تخلیقی بے خودی طاری ہوتی ہے۔ مجھے ناول لکھنے میں اتنا وقت نہیں لگتا جتنا اس کو محسوس کرنے، سوچنے اور اس کو ذہنی طور پر پکانے میں لگتا ہے۔ افسانہ تو چند گھنٹوں میں لکھ دیا جاتا ہے۔ ناول کا معاملہ ذرا فرصت طلب ہے۔ بہرحال لکھتے وقت میرے ہاں اس قدر آمد اور روانی ہوتی ہے کہ سوچنے کی ضرورت کم ہی پڑتی

ہے بلکہ گھریلو جھگڑے، قصّے، آنے جانے والے، یا کوئی رکاوٹ پڑے تو مجھے لگتا ہے کہ کسی نے سامنے پتھر لڑھکا دیا۔

س :- کیا آپ اپنے پہلے ڈرافٹ پر نظر ثانی کرتی ہیں اور اُس میں تبدیلیاں کرتی ہیں؟ کیا نظر ثانی کے وقت مختصر زبان کی تبدیلی ہوتی ہے یا قصّے پلاٹ اور نقطۂ نظر کی کوئی بنیادی تبدیلی ہو جاتی ہے؟

ج :- جی ہاں میں اپنے پہلے ڈرافٹ پر نظر ثانی کرتی ہوں۔ میرا کوئی پہلا ڈرافٹ آخری اور فائنل نہیں ہوتا۔ بعض اوقات ایک ہی چیز کو کئی بار لکھتی ہوں۔ جب تک مطمئن نہیں ہو جاتی، اُس کو شائع نہیں کراتی۔ ریڈیو تقریر تک دو تین بار لکھتی ہوں۔ ایک بات بتاؤں۔ دراصل مجھے طویل مضامین وغیرہ لکھنے کی عادت ہے اور ریڈیو کی تقریریں وقت کی پابندی کراتی ہیں۔ بہرصورت ریڈیو کے لیے لکھنے سے مجھے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ مختصر تقریریں لکھنے کی بھی عادت ہو گئی۔ یہاں یہ بات بتا دینا بھی ضروری خیال کرتی ہوں کہ میری ابتدائی تحریروں پر ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور میرے بھائی خواجہ غلام السیّدین صاحب نے کافی اصلاح دی ہیں۔ میرے بھائی تو بچپن سے میرے اُستاد رہے ہیں۔ شادی کے بعد میرے شوہر ڈاکٹر سید عابد حسین سے مشورے کیے ہیں اور انھوں نے اصلاح بھی دی ہے۔ لیکن بنیادی طور پر میرے اور ان دونوں ادیبوں کے اسٹائل میں زبردست فرق ہے جسے ارباب فکر و فن محسوس کرتے ہیں۔

س :- کیا آپ اپنی بعض کہانیوں اور افسانوں کے محرکات پر روشنی ڈالنا پسند کریں گی؟

ج :- عنوان صاحب۔ یہ تو آپ بھی مانتے ہیں کہ ادب اور زندگی کا چولی دامن کا رشتہ ہے۔ ادب محض تخیل کی رنگین وادیوں میں بھٹکنے کا نام نہیں۔ اس کی بنیاد ٹھوس زمین پر ہوتی ہے۔ مگر ادب تخیل کی گزرگاہ سے ضرور گزرتا ہے، جو اس کو تاریخ سے ممتاز کرتا ہے اور اس کو نئی معنویت کا حامل بنا دیتا ہے۔ میری اکثر کہانیاں اور ناول زندگی سے بہت قریب ہیں اور اسی کی وجہ سے بعض لوگ یہ تہمت لگاتے ہیں کہ فلاں کا قصہ یا کردار پیش کیا گیا ہے۔ مگر یہ تہمت یا الزام تو دنیا کے بڑے بڑے ادیبوں پر بھی لگایا گیا ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر میرے کردار زندہ انسانوں سے مشابہت رکھتے ہیں تو میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوں۔ مثلاً میری ایک کہانی ہے "پلڑا کدھر جھکتا ہے"۔ ایک لڑکی

جو بہت خوبصورت اور ہنرمند تھی محض اس لیے ٹھکرا دی گئی کہ لڑکا ذرا خوش حال تھا۔ میرے ناولوں کے کردار بھی ایسے ہی لوگوں کے گرد گھومتے ہیں جنھیں میں اچھی طرح جانتی ہوں "یادوں کے چراغ" میرا ناول بہت پسند کیا گیا۔ اس میں زندگی کے سچّے حقائق کو تخیّل اور تخلیق کے عمل سے گزرنا پڑا تب جا کر ناول بنا۔ "آتش خاموش" جامعہ اور جامعہ کی زندگی کے پس منظر میں اُبھرتا ہے۔ میرے کرداروں پر اکثر پڑھنے والوں کو جو سچّے کردار ہونے کا گمان ہوتا ہے، اُس کی وجہ یہ ہے کہ میں اپنے افسانوی ادب میں وہی زندگی پیش کرتی ہوں جس سے مجھے گہری واقفیت ہوتی ہے۔ ہوا میں محل نہیں بناتی۔"

س:۔ میں نے آپ کے افسانوں اور ناولوں کو پڑھ کر اکثر ایسا تاثر قبول کیا ہے کہ آپ کی تخلیقات میں اخلاقی قدروں کا غلبہ ہے اور آپ خیر و شر کی جنگ میں "خیر" کی ہم نوا ہیں۔

ج:۔ یہ تو آپ نے خوب پوچھا۔ میں سمجھتی ہوں ہر انسان خاص طور پر ہر فنکار کو خیر کا ہم نوا ہونا ہی چاہیے۔ میں بھی اعلا اخلاقی اقدار کو عزیز رکھتی ہوں۔ میرا یقین ہے کہ ہر انسان میں نیکی اور شرافت ہوتی ہے۔ میرے بعض کرداروں کو اخلاقی صفات کا پیکر دیکھ کر بعض لوگوں کو یہ اعتراض ہوتا ہے کہ میرے کردار مثالی ہوتے ہیں۔ اب میں کس کس کو سمجھاتی پھروں کہ میں نے ایسے اشخاص زندگی میں دیکھے ہیں، برتے ہیں اور ان کا اثر قبول کیا ہے اور یہ سب جیتے جاگتے اسی دنیا کے انسان ہیں۔ اگر میرے کرداروں میں مثال پسندی کی جھلک ہے تو وہ انھیں مثالی شخصیتوں کا اثر ہے۔ ویسے میرے یہاں بہت سے ایسے کردار بھی ملیں گے جن میں انسانی کمزوریاں اور خامیاں ہیں اور آپ کو ایک مزے کی بات بتاؤں، میرے بہت سے پڑھنے والے انھیں کرداروں کو پسند کرتے ہیں اور حقیقت سے بہت قریب بتاتے ہیں۔

س:۔ کیا آپ خواتین ادیب اور مرد ادیبوں کی تحریروں میں اسلوب مواد طرزِ پیش کش یا کسی اور نقطۂ نظر سے کوئی فرق محسوس کرتی ہیں۔

ج:۔ جی ہاں ادیب جب کوئی ناول یا افسانہ لکھتا ہے تو ظاہر ہے کہ موضوع اس کے ماحول، تجربے اور دلچسپی کے پیشِ نظر ہی چُنا جائے گا اب اگر آپ غور سے ان دونوں

کی تخلیقات کو پڑھیں تو آپ کو نمایاں فرق یہ محسوس ہوگا کہ مرد ادیبوں کے یہاں کینوس عام طور پر وسیع ہوتا ہے اور عورت ادیبوں کا مختصر۔ وہ اپنے تجربے اور دلچسپی، نیز ماحول کے مطابق پلاٹ چنتی ہیں۔ اُردو میں اگر آپ گنتی کی دو تین عورتوں کو نکال دیں تو دیکھیں گے کہ عورت کی کہانیوں کا محور معاشرتی زندگی اور خاندانی زندگی ہوتا ہے اور اس کے مسائل ہوتے ہیں۔

دوسرے جذبات اور سیرت نگاری میں بھی فرق ہوتا ہے۔ مثلاً ہوسکتا ہے کہ وہ کبھی طوائف کی زندگی پر بھی خامہ فرسائی کرے لیکن اس میں بھی اس کا اپنا نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ مرد ادیب کی طرح وہ اس کے جسم کے حُسن یا نازو ادا یا گھناونی زندگی کی عکاسی نہ کرے گی، بلکہ اس کے دل کے اندر بھڑکنے والے شعلوں کو دیکھے گی۔ اس کی اندر بیوی اور ماں بننے کی جو قدرتی لگن ہوتی ہے اُس کو محسوس کرے گی۔ بات یہ ہے کہ ادیب مرد ہو یا عورت، اگر ذاتی تجربے اور گہرے مشاہدے کے بغیر کوئی پلاٹ مرتب کریں گے تو ان میں اور سب خوبیاں ممکن ہوسکتی ہیں، مگر حقیقت اور صداقت کی کمی محسوس ہوگی۔

تیسرا فرق مرد ادیب اور عورت ادیب کی تخلیقات میں مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ عورت اگرچہ محدود زندگی دکھاتی ہے۔ مگر اس کا مشاہدہ گہرا ہوتا ہے۔ ماحول کا بھی اور کردار کا بھی۔ اس لیے جیتے جاگتے کردار آپ کو عورت ادیب کے یہاں زیادہ ملیں گے۔ یہی حال جذبات نگاری اور سیرت کشی میں نظر آئے گا۔ جذباتی شدّت پسندی عورت ادیب کے ناولوں کی کمزوری بھی ہے۔ اور قوّت بھی۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟ — یعنی اگر ضبط اور توازن کے ساتھ جذبات کشی کی جائے تو وہ بہت بڑی خوبی بن جاتی ہے، ورنہ بہت بڑی خامی۔ ایک اور فرق آپ یہ محسوس کرسکتے ہیں کہ عورت ادیب جس طرح عورت کے گہرے احساسات اور سیرت کی باریکیوں کو دکھاسکتی ہے، ویسے مرد کی نہیں دکھا سکتی۔ اور یہی حال مرد کا ہے کہ وہ مرد کے خیالات و جذبات کو زیادہ خوبی سے دکھاتا ہے۔ مگر عورت کے معاملے میں ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ وہ اس کے جذبات اور احساسات کو بھی اپنے رنگ میں پیش کرتا ہے۔ ایک بڑا فرق زبان کا ہے، آپ مانتے ہیں نا کہ زبان جو ٹکسالی ہوتی ہے، وہ مادری ہوتی ہے۔

عورت اگر زبان کو اچھی طرح سیکھے اور اُس پر قدرت حاصل کرے تو اس کی زبان زیادہ سلیس اور فطری ہو گی۔

س :۔ اس نقطۂ نظر سے آپ کے افسانوی ادب کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں۔ اگر اُن پر روشنی ڈال سکیں تو اچھا ہے۔

ج :۔ یہ آپ نے بڑا مشکل سوال کر دیا۔ ایک بات آپ کو بتاؤں، میرا خیال ہے کہ ہر سچا ادیب جب تخلیق کرتا ہے تو وہ اُن ساری خصوصیات کو جو نقّاد یا قاری اُس کے یہاں تلاش کرتے ہیں، پیش نظر نہیں رکھتا۔ ایک ہلکا سا خاکہ پلاٹ کا ذہن میں ضرور گزرتا ہے۔ چند کردار بھی دماغ میں موجود ہوتے ہیں۔ ماحول وغیرہ کے بارے میں بھی وہ سوچتا ہے۔ مگر اس طرح نہیں جیسے دوسرے سوچتے ہیں۔ میں تفصیل میں نہ جا کر آپ کے سوال کا مختصر جواب دوں گی۔ میرے ناول اور کہانیاں سُنی سنائی یا پڑھی پڑھائی باتوں پر مبنی نہیں ہوتے۔ مثلاً میں روس، امریکہ یا کناڈا کی زندگی اپنے ناولوں اور افسانوں میں پیش نہیں کروں گی۔ یا اُن سیاسی نظریات اور جدوجہد کا ذکر نہیں کروں گی جن کا مجھے ذاتی اور گہرا تجربہ نہیں ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ایسی تخلیقات شاید وقتی شہرت پالیں، مگر اُن کی دائمی یا پائیدار بنیاد نہیں ہوتی۔ جس آگ سے میں خود نہیں گزری اس کی لپٹ دوسروں کو کیسے محسوس ہو گی۔ میرا یہ خیال بھی ہے کہ میرے کردار جیتے جاگتے ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں میں آپ کے پہلے سوالوں کے جوابات میں کافی بتا چکی ہوں۔"

س :۔ باجی! میں نے آپ کی کتاب "جانے والوں کی یاد آتی ہے" پڑھی تو کئی جگہ دل بھر آیا۔ آپ کی تحریروں میں اتنا درد کیوں ہے؟

ج :۔ ہر فنکار کے فن پر اس کے ذاتی رنج و غم کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ عنوان صاحب کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ میں دو سال کی عمر سے ۶۲ سال کی عمر تک مسلسل غموں کی بھٹی میں جلتی رہی ہوں۔ آنکھ کھولتے ہی والد کا انتقال ہوا۔ ۴ سال کی تھی کہ والدہ جنت کو سدھاریں۔ ۱۵ سال کی تھی کہ بڑی بہن کا عنفوان شباب میں انتقال ہو گیا۔ شادی کے بعد میری اکلوتی بچی زندہ نہیں بچی اور یہ غم رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ اب جب غم کی چوٹ پڑتی ہے تو سارے شعوری اور غیر شعوری غم جاگ اٹھتے ہیں۔ مگر جہاں تک ناول اور افسانے کا تعلق ہے، میں نے غمِ جاناں کو غمِ دوراں بنانے کی کوشش کی ہے۔ ہر دھڑکتے

دل کا درد محسوس کیا ہے۔ اسی لیے میرے پڑھنے والوں نے میرے اُن ناولوں اور افسانوں کو زیادہ سراہا ہے جو تڑپ بجڑی ہیں۔

س :- باجی آپ سے ایک آخری سوال اور پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ نے کیفیت وکمیت کے لحاظ سے بہت لکھا اور خوب لکھا مگر نقادوں نے آپ کی طرف سے چشم پوشی کی ہے۔ اس کے اسباب کیا ہیں؟

ج :- یہ سوال آپ مجھ سے کر رہے ہیں؟ ارے بھئی نقادانِ فن سے کیجیے۔ میرا کام لکھنا ہے، اپنا قصیدہ پڑھنا نہیں۔ جو ادبی فیشن بن گیا ہے۔ اس کی اصل وجہ کیا ہے، یہ تو شاید وہ حضرات ہی بتا سکیں جو ایک ہلدی کی گرہ والے پنساری کا دس صفحوں میں ذکر کر کے بھی مطمئن نہ ہوں۔ شاید اسی لیے کہ وہ اُن کا دوست ہے، یا اس سے کوئی مفاد وابستہ ہے۔ اور جو لوگ ان کے ازم یا ان کے خیالات پر پورے نہ اتریں یا جن سے ان کو کوئی خاص فائدہ نہ پہنچے یا جو اُن کی خوشامد نہ کرے یا اپنے لیے کوشش کرتا نہ پھرے، وہ اکثر اُن کے وجود ہی سے یکسر منکر ہو جاتے ہیں۔ شاید مجھے نظرانداز کرنے کی یہی وجہ ہو کہ میں نے اہمیت کام کو دی ہے۔ اردو کی خدمت اپنا مقصدِ زندگی بنا لیا ہے۔ عنوان صاحب، مجھے اس کا یقین ہے کہ ان بیشتر حضرات نے جو چند ادیبوں کی نام لے کر بار بار انھیں دُہراتے ہیں۔ یا جو یہ سمجھتے ہیں کہ صرف "مُستند ہے میرا فرمایا ہوا" یا میرے گروہ یا احباب کا فرمایا ہوا۔ اُن میں سے اکثر نے میری کوئی کتاب نہیں پڑھی ہے۔ شاید نام بھی سب کتابوں کے نہ سُنے ہوں۔ یا اگر پڑھی ہیں تو تعصب کی عینک لگا کر۔ ویسے میں ایسے نقادوں سے واقف ہوں جو زبانی یا نجی مجلسوں میں میرے ادبی وتخلیقی کام کی تعریف کرتے ہیں۔ مگر اپنے مضامین میں میرا نام نہیں لیتے۔ ویسے ایسے تبصرہ نگار بھی ہیں جنھوں نے میرے کام کو سراہا ہے اور میرے ادبی وعلمی کاموں کی قدر کی ہے۔ جو میرے کام کو بے لاگ طریقے سے پڑھ کر تعریف یا تنقیص کرتے ہیں۔ میرے دل پر دراصل اُن ہی کا اثر ہوتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ میرے قدر دان میرے پڑھنے والے ہیں۔ ان کی قدر دانی، اُن کی ہمت افزائی، اُن کی محبت اور خلوص اور دل سے نکلی تعریف میرے کام کا انعام ہے۔ دراصل لکھتی میں اُنھیں کے لیے ہوں۔

آخر میں ممتاز ادیب اور دانش ور ڈاکٹر سیّد عابد حسین صاحب کے ان الفاظ پر اس انٹرویو کو ختم کرتا ہوں جو موصوف نے کسی موقع پر صالحہ عابد حسین صاحبہ کے فن اور اسلوب کے بارے میں لکھے تھے۔

"صالحہ عابد حسین کی تحریر کی چار نمایاں خصوصیات ہیں۔

(۱) ۔ زبان و بیان کی سلاست، روانی اور پاکیزگی جو خود اُن کی طبعِ سلیم اور ذوقِ صحیح کی پیداوار ہے۔

(۲) ۔ قدیم اور جدید تہذیبی اقدار کی کش مکش کا شعور زمانے کے موجودہ بحرانی دَور کی دین ہے۔

(۳) ۔ گہرے سماجی اور اخلاقی شعور کی مدد سے نئی اور پُرانی قدروں کو سمونے کی کوشش جو اُن کی خاندانی روایات کا عطیّہ ہے۔

(۴) ۔ اخلاقی اور اصلاحی نقطۂ نظر کے باوجود فن کے تقاضوں کا پُورا خیال رکھنا اور قصّے اور مضمون کی دلچسپی کو قائم رکھنا جو سچے فنکار کی پہچان ہے۔

یہ خصوصیت ان کے نئے ناول "یادوں کے چراغ" میں واضح طور پر نظر آتی ہیں... اُن کی طبیعت کی جولانی اور خیالی کی ندرت اور تازگی کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے رشحاتِ قلم کا جو سلسلہ چالیس برس پہلے شروع ہوا تھا، ابھی اور بہت دن تک جاری رہے گا۔"

ذکیہ ظہیر

میری پھوپی جان — صالحہ عابد حسین

صالحہ عابد حسین کی سیرت، تصانیف اور ادبی خدمات کے بارے میں بہت کچھ لکھا اور کہا گیا ہے اور کہا جائے گا۔ مگر میں صرف اپنے اور اپنے خاندان سے اُن کے رشتے کی جھلک میں اُن کی ذاتی تصویر دکھانا چاہوں گی، اور یہ بتانا چاہوں گی کہ اُن کی سیرت کیا تھی، اور اس کا مجھ پر اور میری نسل پر کیا اثر ہوا ہے۔

ہر عظیم شخص کی شخصیت کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک عام لوگوں کے لیے، اور دوسرا اپنے نزدیکی رشتہ داروں اور خاندان کے لیے۔ بڑائی یا شہرت میرے نزدیک دولت، رسوخ، عہدے اور طاقت سے نہیں ہوتی ہے بلکہ شخصیت کی عظمت، علم دوستی، اصول پرستی اور روشن خیالی سے۔ اور اس لحاظ سے یہ میری خوش قسمتی ہے کہ ایسی کئی مہان ہستیوں سے میرا رشتہ رہا ہے، اور ان ہستیوں میں ہی اپنی پھوپی صالحہ عابد حسین کو مانتی ہوں۔ ویسے تو میرے خاندان میں مولانا حالی سے لے کر اب تک کئی عظیم اور مشہور لوگ گزرے ہیں۔ مگر میرا اپنا ذاتی تعلق، اپنے والد خواجہ غلام السیدین، اپنے چچا خواجہ احمد عباس اور اپنی پھوپی جان صالحہ عابد حسین سے بہت قریبی رہا ہے۔

پھوپی جان سے میرا رشتہ کچھ خاص ہی تھا۔ اپنے والدین کی تیسری لڑکی ہو جانے کی وجہ سے شاید میرے رشتہ دار کچھ مایوس اور رنجیدہ تھے جس کی وجہ سے پھوپی جان کے وسیع دل میں میرے لیے کچھ خاص نرمی اور محبت پیدا ہو گئی۔ اور میں

پھوپی جان کی بیٹی کہلانے لگی۔ بچپن ہی سے میرے کان میں مصداق (جو اُن کا گھریلو پکارنے کا نام تھا) اور عابد صاحب کے نام کی آواز پڑی۔ وہ میری والدہ کی خاص سہیلی، چہیتی نند، راز دار مشیر کار، اور میرے والد کی عاشق زار، خیر خواہ بہن اور دوست تھیں ہر موقع، ہر خوشی، ہر تکلیف میں مصداق اور عابد صاحب بلائے جاتے یا خود ہی آجاتے۔ شروع شروع کا زمانہ تو مجھے زیادہ یاد نہیں مگر سنا ہے کہ میری، اور میری ہر بہن کی پیدائش کے موقع پر وہ موجود تھیں۔ ہوش سنبھالنے کے بعد کشمیر کے سات سال کے قیام کی ہر یاد پھوپی جان سے وابستہ ہے۔ ہمارے گھر میں ایک کمرہ ہمیشہ مصداق کا کمرہ کہلاتا تھا جہاں وہ دونوں ہر سال اگر کئی مہینے ہمارے ساتھ گزارتے، اور ہم سب بہت بے چینی سے ان دنوں کا انتظار کرتے۔ ان کے آتے ہی گھر میں خوب رونق ہو جاتی۔ خوب سیر اور پکنک اور دوروں کے پروگرام بنتے اور ہم سب ایک رشتے کی کڑی میں پروئے ہوئے ساتھ ساتھ خوشی سے ہر جگہ گھومتے پھرتے رہتے ۔ ۔ ۔ اور وقت تیزی سے پرواز کرتا رہتا ۔ ۔ ۔ ۔

بچپن ہی سے میں پھوپی جان کی دلکش شخصیت، موہنی باتوں محبت اور ہمدردی کی رو میں ڈوب کر اُن کو تکا کرتی اور مسحور ہو کر ان کی باتیں سنتی۔ اور پھر جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ باوجود فارمل تعلیم نہ پانے کے ایک بہت اچھی اور کامیاب مصنفہ ہیں، تو مجھ کو ان کی شخصیت اور بھی محبوب لگنے لگی۔ اور ہم بہنیں اور ہماری ہم عمر لڑکیاں ان کو اپنا آئیڈیل سمجھنے لگے۔ اور ان کے گرد طرح طرح کے افسانے اور کہانیاں گھڑ کر ان کو پُر اسرار بنانے لگے۔ اور پھر جب ہم کو اردو پڑھنا آیا، تو اسی زمانے میں پھوپی جان کی "عذرا" نئی نئی شائع ہوئی تھی۔ نہ معلوم اس کی ہیروئن عذرا میں کسی شخصیت کی عکاسی تھی مگر ہم میں سے ہر ایک خود کو عذرا سمجھ کر اس میں اپنی جھلک پاتے اور طرح طرح کے فرضی قلعے بنا کر اپنے افکار کو ڈھونڈا کرتے۔ اسی طرح ہماری نو عمری کا تانا بانا پھوپی جان کی کہانیاں، ناول، اور افسانے پڑھنے، اور ان سے اثر انداز ہونے سے جڑا رہا۔ جس سے یقیناً نہ صرف ہم، بلکہ ہماری ہم عصر کتنی ہی نوجوان لڑکیاں متاثر ہوئیں۔ اور ہم سب کی شخصیت کی تکمیل، اور ناپختہ ذہنوں کے خیالات اور قدروں کو ڈھالنے میں یقیناً پھوپی جان کی تصانیف کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔

پھر ۴۷ء میں جب میرے والد بمبئی میں تھے تو پھوپی جان ہمارے پاس وہاں آئیں۔ اسی زمانے میں پاپا تو دل کا دورہ پڑا تھا۔ امی بے حد پریشان تھیں، اور ہم سب غمگین۔ عابد صاحب اور مصداق فوراً ہی آپہنچے۔ عابد صاحب تیمار داری میں ماہر تھے، اور پھوپی جان ہم سب کو سنبھالنے، دلاسا دینے اور گھر کا ماحول ہلکا کرنے میں مصروف ہوگئیں۔ امی تو پاپا کے پاس رہتیں اور ہم سب بچے پھوپی جان کا سہارا ڈھونڈتے گھر مہمانوں سے بھرا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ ذمہ داری اُن کی تھی اور سب سے بڑھ کر سکون اُن کے پاس ہی ملتا تھا۔

اور پھر ۱۹۵۰ء میں ہم سب دہلی آگئے۔ پھوپی جان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اُن کے چہیتے بھائی بھاوج اور بھتیجیاں اب ان کے شہر میں تھیں۔ آج سے ۳۸ سال پہلے نئی دہلی سے اوکھلا جانا ایسا لگتا تھا گویا کسی دوسرے شہر کا سفر کر رہے ہوں۔ ہم لوگ خاص اہتمام سے ایک پکنک کی طرح پورے دن کے لیے اوکھلا جاتے۔ امی پاپا، عابد صاحب ذاکر صاحب، زیدی صاحب، قدسیہ چچی، مجیب صاحب اور چند ہم مزاج اور ہم مذاق لوگ مل کر بیٹھتے۔ خوب دلچسپ گرما گرم گفتگو ہوتی۔ چائے کا دور چلتا۔ بحث مباحثہ، سیاست، ظرافت، معاشیات اور فلسفے کی باتیں ہوتیں۔ اور ہم سب ان بڑے لوگوں کو رشک، فخر اور محبت سے دیکھتے اور ان سے مرعوب ہوتے۔ عجیب بات ہے کہ اس زمانے میں ہمیں محسوس نہیں ہوتا تھا کہ کس کس کی صحبت سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ لیکن اب کئی سالوں کے بعد، جب میں سوچتی ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ان صحبتوں نے میری زندگی پر کتنا دیرپا نقش چھوڑا ہے اور کس طرح میری شخصیت کو ڈھالا اور تراشا ہے۔

یہ زمانہ ہماری زندگی کا ایک بہت پُرسکون زمانہ تھا۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ اس زمانے، بلکہ اس سے پہلے بھی پھوپھی جان تو اکثر مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جامعہ ملیہ میں کام کرنے والے اس زمانے میں تنخواہیں بہت کم لیتے تھے۔ لیکن انھوں نے ہمیں کبھی اس کا احساس نہ ہونے دیا۔ ہماری ہمیشہ خاطر ہوتی۔ بہت مزے کا کھانا، چائے، سالگرہ پر تحفہ، عید پر عیدی، تہوار پر مٹھائی، پھوپی جان کے سلیقے، خندہ پیشانی، خوش انتظامی اور سگھڑپن نے کبھی یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ انھیں کسی چیز کی بھی کمی ہے۔ ان کی فراخ دلی کی یہ انتہا تھی کہ مالی پریشانی کے باوجود

وہ بہت سے حاجت مندوں اور غریبوں کی مدد کرتی رہیں، اور وہ بھی اس طرح گویا لینے والا ان پر احسان کر رہا ہو۔ اور یہ بھی زندگی کا ایک اور سبق ہم نے ان سے سیکھا۔

پھوپی جان کی اپنی اولاد نہ ہونے کا ہمیں مدتوں احساس نہ ہوا۔ ایک تو میں خود کو ان کی بیٹی سمجھتی تھی۔ دوسرے ان کی خوش اخلاقی اور مہمان نوازی کی وجہ سے ہمیشہ ان کا گھر ہر عمر کے لوگوں سے بھرا رہتا۔ شاید اسی طرح وہ اپنی تنہائی اور محرومی کو دور کرتیں۔

۱۹۵۲ء میں جب میرے والدین حکومت کے کام پر چند مہینوں کے لیے عراق بھیجے گئے تو میرا قرعۂ فال پھوپی جان کے نام پڑا۔ اور اس طرح پہلی دفعہ میں نے کئی مہینوں کے لیے اوکھلے کی کھلی فضا اور پھوپی جان کے کشادہ گھر میں پناہ پائی۔ یہ دن بھاپ کی مانند ہوا ہو گئے۔ پھوپی جان کے ہاں حسب توقع ان کی اور عابد صاحب کی بھانجیاں بھتیجیاں، اور دوستوں اور خاندان کی مختلف عمر کی لڑکیاں موجود تھیں۔ جن کے ساتھ دن بھر ہنسی مذاق، فقرہ بازی اور لوگوں کو تختۂ مشق بنانے میں گزر جاتے اور شام میں سب لوگ جمع ہو کر پھوپا جان اور پھوپی جان کی پر مذاق لطیف صحبت سے فیض یاب ہوتے، ان کی پیار بھری ڈانٹ کھاتے اور ان کی نصیحت آمیز باتیں سنتے۔ اور اگر کبھی امی یا پاپا کی یاد بھی آتی تو پھوپی جان کی گود میں سر چھپا کر میں سب کچھ بھول جاتی اور یہ احساس ہوتا جیسے میں گھر آ گئی ہوں۔

اور اس طرح زندگی کے ہر بڑے چھوٹے اہم سنجیدہ، خوشی اور غم کے مرحلوں میں ہمیشہ پھوپی جان کا ساتھ رہا۔ وہ ہماری زندگی کا ایسا اہم جزو رہی ہیں کہ ان کے بغیر زندگی کا تصور مشکل لگتا ہے۔ ہم سب بہنوں کی شادیوں میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہیں۔ ان کے بغیر لگتا تھا کوئی تقریب ہو ہی نہیں سکتی۔ کوئی غم ہم جھیل ہی نہیں سکتے۔

امی کے انتقال کے بعد سب سے محبت بھرا، تسکین آمیز ہاتھ ہمارے سر پر اُن ہی کا تھا، پاپا کے سدھارنے پر جب خود ان کا دل غم سے لوٹ رہا تھا۔ لیکن ہمارے جو آنسو اُن کی گود میں مُنہ چھپا کر نکلے وہ کسی اور دامن میں جذب ہی نہ ہو سکتے تھے۔ ایک کے بعد ایک، بھائیوں، بہنوں، بھاوجوں، بھتیجی، بھانجی، دوست، عزیز، احباب

اور آخر میں چاہنے والے شوہر کے غم نے ان کو تقریباً توڑ دیا ہے۔ مگر صبر کرنے کی مثال کوئی ان سے سیکھے۔ صبر اور شکر، خدا پر عقیدہ، مذہب کی پختگی، اور اصولوں کی پابندگی۔ شاید یہی صفات تھیں جنھوں نے باوجود ان شدید صدموں کے ان کی شخصیت کی نرمی اور دلکشی کو قائم رکھا، اور تلخ مزاجی اور شکوہ سنجی سے بچایا۔ خود میرے اوپر جب جوان بیٹے کی موت کا شدید سانحہ گزرا، جس کے بعد کسی طرح قرار نہ آتا تھا تو پھوپی جان کی کہانی "اندمال" جو انھوں نے صرف میرے لیے لکھی تھی، پڑھ کر میرے زخموں پر چند نے مرہم لگایا۔ اور ان کی برداشت، ہمت اور صبر کی قوت اور عقیدہ دیکھ کر، ان کی مثال سے مجھے بھی صبر آیا۔ نہ جانے یہ ہمارے بزرگ کس سانچے میں ڈھلے تھے کہ ان کے ایمان اور عقیدے کی ڈور کبھی نہ ٹوٹی۔ اور ان کے لب پر مشکل سے مشکل سانحے میں بھی ہمیشہ صبر اور شکر کا کلمہ ہی آیا۔ اُن کے صبر کی اس بے پناہ طاقت کے سامنے ہمارا سر جھک جاتا ہے۔

ہمارے والد خواجہ غلام السیدین اور چچا خواجہ احمد عباس کی طرح پھوپی جان کی اصول پرستی بھی بے مثال ہے۔ انھوں نے کبھی اپنی قدروں اور اصول سے سمجھوتہ نہ کیا۔

بات سچّی کہی اور انگلیاں اُٹھیں سب کی۔

حالات چاہے بدلے، کس کس طرح کی مشکلات اور دباؤ پڑے، لیکن ان کی خودداری، اصول پرستی، حق گوئی، انصاف پسندی نے آخر تک کسی کے سامنے سر نہ جھکایا۔ ان کے لیے سچے دل سے کہا جا سکتا ہے۔ خاکساروں سے خاکساری ہے، سربلندوں سے انکسار نہیں ان کو جتنے بھی اعزاز، تحفے، انعام اور عزت ملی وہ خود اپنے پیروں چل کر ان کے ہاں آئے۔ خود انھوں نے کسی طرح نہ اُن کی تمنا کی، نہ ہی اس کے لیے کوئی کوشش یا خواہش۔ ان کے مدّاحوں اور چاہنے والوں نے ان کو سراہا، تعریف کی اور خراج تحسین پیش کیا اور وہ خود صرف اپنی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اس کے جواب میں گویا کہتی رہیں۔ "میں کس قابل ہوں!"

پھوپی جان کی ایک اور عادت جس نے مجھے بہت متاثر کیا ہے وہ ہے ان کے کام کرنے کی عادت۔ میرے ذہن میں، بچپن سے ان کی خاص تصویر، لکھنے کی

میز کے سامنے بیٹھی، قلم ہاتھ میں لکھتے ہوئے رہے (اسی لیے شاید یہ لوگ رائٹر کہلاتے ہیں۔) ان کی یہ عادت میں ۱۹۴۵ء سے دیکھتی آرہی ہوں۔ بالکل یہی عادت میرے والد کی بھی تھی۔ چاہے یہ لوگ کتنے ہی مصروف ہوں، طبیعت خراب ہو، رات بھر جاگے ہوں، تکلیفات اور بیماری کا سامنا ہو، لیکن روز چند گھنٹے بیٹھ کر لکھنے کی یہ عادت، یہ ٹریننگ، یہ ڈسپلن، یہ دُھن ہمیشہ جاری رہی۔ شاید اسی کام کی دُھن میں وہ ہمیشہ اپنے دکھوں، اپنی محرومیوں اور اپنے پیاروں کی جدائی کے غم کو جذب کر دیتیں تھیں۔

آج اس بھری دنیا میں جب ہمارے سب بزرگ ہمارا ساتھ چھوڑ چکے ہیں، آج بھی پھوپی جان کی گود میں سر چھپا کر وہی سکون، وہی محبت، وہی رواداری اور دلداری ملتی ہے۔ جو ساری عمر ہماری زندگی کا جز رہی ہے اور جس کے بغیر زندگی کا تصور بھی مشکل ہے۔ وہ ہمارے سب خاندان کا نعم البدل ہیں، حالی کے نام کا چراغ — اب وہ ہی ہمارے غموں کا مداوا ہیں۔ اور بس خدا سے یہی دعا ہے کہ وہ ان کو ہمیشہ ہمارے سر پر قائم رکھے۔

(یہ مضمون شامِ صالحہ عابد حسین کے موقع پر اُن کی زندگی میں پڑھا گیا)

محبت فاطمہ

کروں کس طرح خطاب تمھیں

زمین کو دھرتی ماں کہتے ہیں کہ وہ جینے کے لیے لوازمات زندگی کے بےحساب سامان پیدا کرتی ہے۔ اور انسان کے ہر طرح آرام و آسایش انسانی ارتقا کے ہزاروں وسیلے دریافت ہوئے ہیں۔ جس پر اتنی لمبی چوڑی دنیا بستی ہے۔ اس کے سینے سے نہریں، جھیلیں، دریا اور سمندر پیدا ہوئے۔ جن سے سیرابی ملی اور وسائل معاشیات معیشت بھی۔

گنگا کو بھی گنگا میا کہتے ہیں جس کے سوتے اسی زمین سے نکلے اور جس کی لہریں ہر کنارے تک پہنچتی ہیں اور خدا کی مخلوق کو فیض پہنچاتی ہیں۔ کچھ لوگ اس کی پوجا کرتے ہیں اس کے پانی میں نہا کر گناہوں سے پاک ہوجانے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

زمین پر ہی جہاں خدا نے خوبصورت پھول سرسبز و شاداب سبزہ زار پیدا کیے وہاں سایہ دار درخت پیدا کیے کہ جو اُس کے بندوں کو سایہ دیں تھکے ماندے مسافر اس میں آرام کرلیں اور پنکھ پکھیرو اپنا ٹھکانہ بنا کر امان پائیں۔ اسی طرح کچھ انسان اور شخصیتیں ایسی صفات کی حامل ہوتی ہیں۔ اسی زمین پر جنم لیتی ہیں اسی کی آغوش میں ہمیشہ کے لیے سوجاتی ہیں۔ یوں تو ساری کائنات کا خالق تو خدائے وحدہٗ لاشریک ہے مگر انسان اور نباتات وجمادات میں یہ امتیاز ہے کہ مخلوق تو وہ اسی خالق کے ہیں لیکن جذبات اور درد دل احساس کی خصوصیت نے اسے اشرف المخلوقات کا شرف بخشا۔

ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

اپنی ممانی جان کو میں کیا نام دوں ؟ جب ان کی زندگی کے بارے میں (جس میں چالیس سال

کی شریک رہی ہوں۔ جو سب سے پہلے جذبہ ان کی شخصیت کا ذہن میں ابھرتا ہے مامتا بھری محبت۔ ایک بے بناوٹ بے اختیار جذبۂ محبت۔ پُرخلوص اور گہری محبت۔ انھوں نے ہرایک کو اپنی محبت دی بھی اور محبت پائی بھی اور اکثر صرف انسانیت کے رشتے سے ان کی محبت باہیں پھیلائے رہی۔

۳۶-۱۹۲۵ء میں انھوں نے بے ہوشی کی حالت میں اپنی پہلی اور آخری بچّی کو جنم دیا اس طرح کہ خود اُن کی جان خطرے میں پڑ گئی اور ان کی بچّی دنیا میں آنے سے پہلے ہی واپس چلی گئی تھی۔ صرف بے جان جسم خاک میں ملنا تھا۔ ماںتا کو مجروح ہونا تھا۔ اور ایک داغ بن کر ماں کے دل میں رہنا تھا۔ سو وہ اپنی بچّی کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکیں۔ لیکن وہ ان کے تصور میں زندگی بھر زندہ رہی۔ اور اپنی اس محرومی و پیاس کو انھوں نے خاندان، پاس پڑوس کی ہر لڑکی کو اپنی بچّی سمجھ کر چاہا اور خود کو سیراب کیا جیسے ہر لڑکی میں انھیں اپنی بچی کی شکل نظر آتی ہو۔ وہ مجبور ہو جاتی تھیں کہ ہر لڑکی کی تربیت ہو۔ اس کی شخصیت بنے اس کی صلاحیتوں کو نشو و نما کا موقع ملے اور مستقبل سنورے اسی میں وہ اپنے لیے زخم کا اندمال تلاش کرتی رہیں اور اس کا جواز بھی کہ شاید خدا کی یہی مصلحت ہو کہ میری ماںتا اور محبت محدود نہ ہو جائے۔ کیا یہ ان کی وسیع القلبی اور وسیع النظری کی دلیل نہیں ہے؟ اور جہاں تک واقف ہوں انھوں نے اپنے ہر دکھ درد غم کا درماں دوسروں کے درد کو سمجھ کر دوسروں کی ہمدردی اور دکھ سکھ کی شریک ہو کر ہی پایا۔ صحت کے اعتبار سے پیدائشی کمزور تھیں۔ اور پھر چودہ برس کی عمر سے ان کی بیماریوں کا آغاز ہوا۔ کس کس طرح امراض، آپریشن، زندگی کی کشمکش سے گزریں۔ دنیاوی آرام و آسایش ان کے حصّے میں محدود تھیں۔ لیکن خدمت خلق خاموش عزیز و اقربا پروری۔ حق گوئی و حق کوشی، ایک مضبوط و راسخ مذہبی عقیدہ ان کی سیرت میں رچا بسا تھا وہاں میانہ روی، صاف گوئی، صاف دلی، دنیاوی فرائض اخلاقی و منصبی سے بچنا یا کترانا ان کا شعار نہ تھا۔ دروغ گوئی اور ریاکاری انھیں سخت ناگوار تھی کیونکہ وہ بے لاگ بات کرتی تھیں اور خود اُن کے قول کے مطابق ان کا چہرہ ان کے دلی جذبوں کا آئینہ تھا۔ وہ کچھ آدرش اور روایات بہت عزیز رکھتی تھیں جن پر چوٹ پڑنے سے ان کو دلی اذیت ہوتی تھی ان کی شخصیت کا بہت اہم پہلو ہے توازن اور اعتدال۔ سوشل تعلقات میں دوسروں کی امداد اور مسائل کے حل کرنے میں ایک حدِ فاصل ضرور رکھتی تھیں۔ اسی لیے

انھوں نے دوسروں کے ساتھ سلوک کیے لیکن زندگی کے کسی کٹھن موقع پر انھیں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور نہیں کیا۔ اپنی خودداری، وقار کا پاس رہتا تھا۔ وہ خلوص و محبت کا جواب خلوص و محبت سے چاہتی تھیں کون ہے جو اپنے جذبوں کی پذیرائی نہیں چاہتا؟

اس میں شک نہیں کہ وہ کچھ پرانی روایات و عہد کی علمبردار تھیں۔ اور بدلتے وقت کی رفتار اور رنگ بدلتی تہذیب و ترقی یافتہ معیاروں سے ان کے اپنے معیاروں اور اصولوں پر زد پڑی۔ جس کا انھیں صدمہ تھا۔ لیکن وہ خود لکیر کی فقیر بنے رہنے کی بھی قائل نہیں تھیں۔ اور نہ حقیقت کو روایات میں کھونا پسند کرتی تھیں۔ تہذیب نو سے پرخاش بھی نہ تھی اور طرز کہن پر اڑ جانے پر اصرار بھی نہ تھا۔ وقت کے تقاضوں کو سمجھنے کا ظرف رکھتی تھیں۔ مگر کچھ صدمے انھیں اندر ہی اندر توڑ رہے تھے کہ ان کے اپنے آدرشوں اور اصولوں پر ضرب لگ رہی تھی لیکن وہ راہ کی دیوار بننا نہیں چاہتی تھیں اور اس طرح انھوں نے اس کٹھن منزل کو سر کر لیا تھا۔ وہ اپنے وطن پانی پت سے دلی تعلق رکھتی تھیں۔ جو اب دیار غیر بن گیا تھا۔ اس کا بھی صدمہ اٹھایا اپنے ملک و قوم سے محبت تھی وہ سیاسی شعور بھی رکھتی تھیں مگر سیاست گھریلو ہو یا ملک کی وہ اس سے گریزاں ہی رہیں۔ قرآن و سنت کی روشنی میں عورتوں کے ساتھ بے انصافی، حق تلفی، اور ذلت سے شاکی تھیں ہندستانی عورت کی سماجی پس ماندگی کا دکھ بھرا احساس تھا۔ وہ سماج میں عورت کا درجہ برابر کا چاہتی تھیں۔

وہ ایک سچی مومنہ عبادت گزار اللہ کی بندی تھیں اب سوال ذہن میں ابھرے گا کہ کیا وہ اس دنیا سے الگ تھیں کہ کوئی کمزوری نہ تھی کیونکہ بے عیب ذات تو خدا کی ہے۔ لیکن ان کی کمزوریوں کی تلافی کا پلہ بہت بھاری تھا۔ اگر نکتہ چینی کی تو نکتہ شناسی و نکتہ نوازی نہیں کی؟ ان کی زبان یا عمل سے کسی کی دل شکنی ہوئی تو ان کی دلداری، دل جوئی نے اس کی تلافی کر کے دھو دیا۔ درد دل پاس وفا، جذبۂ ایمان ان کا نصب العین رہا۔ خود اعتمادی، قوت ارادی اور بلند حوصلہ و ہمت ان کے زندگی کے سفر میں ان کا بہترین سہارا تھے۔

جس نے ۷۰ سال کے دشوار گزار سفر میں ان کو سنبھالا۔ ادب ان کا میدان عمل تھا ان کا قلم ان کا ہمدم دیرینہ، غم گسار رفیق باوفا ساتھی اس کے بل پر اور صبر کی توفیق کے ساتھ اپنی دوستوں اور عزیزوں، بے مثال شخصیتوں کی دائمی جدائی کے صدمے جھیلے۔ کئی جواں مرگ ان کو داغ مفارقت دے گئے وہ صدمے بھی انھوں نے عبادت اور ایمان و آگہی کی روشنی میں برداشت کیے۔

انھوں نے اپنے فرائضِ منصبی بڑی آن بان سے نباہے اور اکثر ذمہ داریاں خود اپنی مرضی سے اپنے اوپر عائد کیں۔ بارہا انھیں ناقدری ناشناسی کا دکھ سہنا پڑا ان کا شیشۂ دل غبار آلود بھی ہوا اظہار ناراضگی بھی ہوا لیکن اگر کسی نے کسی حد تک تلافی کرنا چاہی تو ایک جھونکے سے ان کا دل صاف ہو جاتا وہ کوتاہی کو معاف کر دیتیں اور محبت کا جذبہ اجاگر ہو جاتا تھا۔

جب ماموں جان جیسا ساتھی ان سے بچھڑا تو وہ زمانہ ہائے وہ ہجر و فراق کا روح فرسا دور احساس تنہائی کا شدید احساس زندگی کا شیرازہ بکھر جانے کا زمانہ بھی انھوں نے صبر عبادت اور زیادہ خدمت کے سہارے گزارا اور اپنے والدین اور دوسرے تمام بزرگوں کے بعد وہ ہمارے لیے ممتا کی چھایا بن گئی تھیں۔ ماموں جان کی ذات ہمارے لیے سایہ بان تھی تو ان کے بعد ممانی جان نے ہمیں اپنی محبت و سرپرستی حاضر و غائب، بہی خواہی اور تعلق خاطر کی چادر میں سمیٹ لیا تھا۔ وہ پھوپھی جان، ممانی جان، اچھی اماں، صالحہ آپا، آپا جی و باجی مصداق کی شکل میں محبوب ترین شخصیت بن گئیں۔

بظاہر وہ لاولد تھیں۔ صرف لفظوں میں یا اس جذبے کے لحاظ سے جو ہر عورت کو قدرت کی طرف سے ملا ہے لیکن معنوی اعتبار سے وہ لاولد نہ تھیں نہ ہیں ان کی تمام نگارشات و تخلیقات زبان بے زبانی سے ان کے ذہن رجحانات، پرواز تخیل، غم دوراں کا اظہار بھی ہیں اور شاہد بھی۔ جو علمی و ادبی دنیا کا انمول سرمایہ ہیں۔

ان کی محبت کے شریک گھر اور خاندان سے الگ دیس پردیس، سرحدوں سے پرے رہنے والے بھی حق دار رہے۔ اور ان کی محبت سب کے لیے عام رہی۔ ان کی محبت اور خلوص کی یادیں ہر اشکبار آنکھ ہے ہر زبان پر ہے کہ آج ہم یتیم ہو گئے بیشتر دلوں میں خلا ہے تو کیا وہ لاولد تھیں۔ وہ نئی پود کی افتاد طبع کے لحاظ سے ان سے بھی متعلق رہتی تھیں ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتی تھیں ہمت افزائی کرتی تھیں اور اس طرح ان کی ہمہ گیر شخصیت نے ایک قطب نما کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ وہ برقعہ نہیں اوڑھتی تھیں لیکن بے پردہ نہ تھیں شرم و حیا ایک باوقار انداز ان کے یہاں خاص مقام رکھتا تھا۔

اور ۹ - ۸ / جنوری ۱۹۸۸ء کو ۲۷ سال کا یہ کٹھن صبر آزما لیکن یادگار سفر تمام ہوا اور وہ تمام تکلیفوں دکھوں سے آزاد ہو گئیں روشنی کا مینار تاریک ہو چکا۔ ممتا بھری آغوش کی گرمی ختم ہوئی شفقت کی ٹھنڈی ہوا بند ہو گئی ہم ان کی سرپرستی سے محروم ہو کر اُن کے غم

ہیں اپنے فرائض اور صبر و تحمل کو چھوڑ دینا ان کی یاد کے ساتھ بے انصافی ہوگی ہمیں ان کے طرز زندگی کو یاد رکھنا ہوگا۔ ان کے عملی سبق کو یاد رکھنا ہوگا کہ ہم ان کے ورثہ دار بن سکیں خدا ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے ان کی یاد ہماری راہنما ہوگی ان کی یاد صحرا کی چاندنی کی طرح دلوں کے بیابان میں چھٹکی رہے گی اب یہی ہماری پونجی ہے اور مشعل راہ بھی۔ وہ انسان تھیں اور بے عیب ذات خدا کی ہوتی ہے ان میں بھی کمزوریاں تھیں لیکن اب یہ اپنے انتخاب کی بات ہے کہ ان کی کمزوریوں کا پلہ بھاری رکھے یا ان کی خوبیوں کا اگر کہیں ان کے عمل یا زبان سے کسی کو تکلیف پہنچی تو کیا دلداری اور دل جوئی نہیں ہوئی۔ ممانی جان تو یادوں کی دھنک چھوڑ گئی ہیں خدا اُن کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے

سیّد علی رضا

صالحہ بہن

مجھے بیگم صالحہ عابد حسین صاحبہ کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔ صالحہ بہن ایک مینارۂ علم وفضل تھیں۔ دنیائے ادب ان کو اردو کی ممتاز ادیبہ اور کثیر التخلیق مصنّفہ کی حیثیت سے جانتی پہچانتی ہے۔ ان کے ادبی مرتبہ اور عظمت پر اور ان کی تخلیقات وتصنیفات پر وہ افراد ہی اظہارِ خیال کر سکتے ہیں جو اس دریا کے شناور ہیں۔ اور بحمد اللہ ایسے افراد کی ایک کہکشاں اس وقت یہاں موجود ہے۔ اس خادم کو آپ کے سامنے صرف اس باہمی محبت اور خلوص کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے جو ہمارے دونوں گھرانوں کے مابین پچاس سال سے زیادہ سے قائم ہے۔ ضمناً مرحومہ کے کچھ حالاتِ زندگی کا ذکر بھی آجائے گا۔

صالحہ بہن برّصغیر کے مشہور تاریخی شہر پانی پت کے ایسے عظیم خانوادہ کی فردِ فرید تھیں جو علم وفضل کے لحاظ سے ہمارے برّصغیر کے مسلمان علمی گھرانوں میں معروف ومانوس تھا۔ اور اس کے ذی علم افراد کا ذکر ہمارے ایسے تمام گھرانوں میں پہنچا ہوا تھا چنانچہ اس خاندان سے پہلے غائبانہ تعارف کی جو یاد ذہن میں ابھرتی ہے۔ وہ اب سے تقریباً ۵۶ سال پہلے کی بات ہے، لکھنؤ میں اس خادم کا پانچویں درجہ میں تعلیم کا سال چل رہا تھا کہ ہمارے گھرانہ میں صالحہ بہن کے والد بزرگوار خواجہ غلام الثقلین صاحب اور چچا خواجہ غلام حسنین صاحب اعلی اللہ مقامہما کا ذکر ہوا کرتا تھا۔ ذکر اس سے پہلے بھی ہوتا ہوگا لیکن وہ یاد نہیں ہے۔ یہ دونوں بزرگ صفِ اوّل کے علما میں شمار ہوتے تھے۔ بات یہ تھی کہ اس زمانے میں برّصغیر میں خاص کر شمالی ہند میں آریہ سماجیوں نے اسلام اور مسلمانوں

کے خلاف خاص مہم چلا رکھتی تھی۔ اور یہ دونوں حضرات اس مہم کا مقابلہ کرنے اور اسلام کا دفاع کرنے میں پیش پیش تھے۔ چنانچہ اس عنوان پر اُن کی تقریروں کی اخباری رپورٹیں اور ان کی لکھی ہوئی کتابیں مسلمانوں میں قدر کی نگاہ سے پڑھی جاتی تھیں۔

خود صالحہ بہن سے تعارف بھی آج سے نصف صدی سے زیادہ پہلے کی بات ہے۔ ہوا یہ کہ ۱۹۳۵ء میں ملازمت کے سلسلہ میں نئی دہلی کے محلّہ قرول باغ میں حسنِ اتفاق سے کرایہ کا جو مکان لیا اس کی اوپر کی منزل میں صالحہ بہن اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف سے بھی ان کے ممتاز علمی اوصاف کی بدولت کچھ عرصہ پہلے لکھنؤ ہی میں غائبانہ تعارف ہوگیا تھا۔ اس مکان میں آکر معلوم ہوا کہ ہمارے برصغیر کے دو عظیم علمی گھرانوں کے یہ دوستارے ازدواجی رشتہ میں منسلک ہو کر قران السعدین کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ چند ہی روز میں تعارف اور ملاقات کا شرف حاصل ہوگیا اور جو محبّت ہم دونوں میاں بیوی اور ان دونوں عظیم شخصیتوں کے مابین اس وقت پیدا ہوگئی وہ روزافزوں استحکام حاصل کرتی رہی۔ یہاں تک کہ گو بعد میں ہمارے درمیان ارضی فاصلے حائل ہوئے لیکن دلوں کی یگانگت میں شمّہ برابر کمی نہیں آئی۔ امیرالمومنین حضرت علیؓ کا قول ہے کہ اَلْقَرَابَۃُ اِلَی الْمَوَدَّۃِ اَحْوَجُ مِنَ الْمَوَدَّۃِ اِلَی الْقَرَابَۃِ یعنی رشتہ محبّت کا محتاج ہے لیکن محبت رشتہ کی محتاج نہیں ہے۔ ہم چاروں کی باہمی محبّت جناب امیر کے اس قول کی صحیح مصداق ثابت ہوئی۔ چنانچہ ہم لوگ دہلی ہی میں تھے کہ ہم کناٹ پلیس کے قریب سرکاری مکان میں منتقل ہو گئے۔ اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب اور صالحہ بہن کا مکان "عابد وِلا" جامعہ نگر میں بن گیا اور یہ لوگ وہاں رہنے لگے۔ لیکن ہماری باہمی محبّت میں کمی تو کیا آتی، اور پختگی آتی چلی گئی۔ خود صالحہ بہن نے اس محبت و یگانگت کا ذکر اپنے ایک مطبوعہ کتابچہ "برائے خاطرِ احباب" یعنی سفرنامۂ امریکہ میں اس طرح کیا ہے:

> "میری عزیز ترین دوست، ظہیر علی رضا (یہ بیگم کا نام ہے) نے دو سال پہلے مجھے کراچی گھسیٹ بلایا تھا۔ اس بار بھی وہی اس سفر کا باعث بنی۔ ہماری پینتالیس سالہ دوستی (یہ پانچ سال پہلے کہا تھا) جس میں اتار چڑھاؤ نہیں آئے۔ جب موقع ملا وہ مجھ سے ہندستان آکر ملتی رہی اور جب مجھ سے ہوسکا میں پاکستان میں اس سے ملی۔ برسوں کا فاصلہ خلوص کی دنیا میں منٹوں میں طے ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر عابد حسین صاحب ملک کے مشہور تعلیمی ادارہ جامعہ ملّیہ اسلامیہ سے وابستہ تھے۔ اس ادارہ کی خصوصیت یہ تھی کہ سربراہ سے لے کر اُس کے سب وابستگان یعنی لکچرار پروفیسر وغیرہ ایثار پسند افراد تھے، جن کو کہنا چاہیے کہ صرف قوتِ لایموت بھر مشاہرہ ملتا تھا حالانکہ یہ لوگ ملک کے دوسرے تعلیمی اداروں میں نہایت اونچی تنخواہیں حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن ملک کے نوخیز طلبہ میں صحیح سیاسی شعور پیدا کرنے اور غلامانہ تعلیم کے بجائے آزاد خیالی کی تعلیم دینے کے عظیم مقاصد کی خاطر یہ حضرات شخصی قربانی دے کر جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے ذریعہ قوم کی خدمت کرنا باعثِ فخر و عزت سمجھتے تھے۔ نتیجتاً ڈاکٹر عابد حسین صاحب اور صالحہ بہن خاصی کفایت شعارانہ زندگی گزارتے تھے۔ اس پر طرّہ یہ کہ ان پر خاصی خاندانی ذمہ داریاں تھیں۔ ڈاکٹر صاحب بھی اور صالحہ بہن بھی دونوں صلۂ رحم کے معاملے میں بہت بلند کردار تھے۔ اپنے تمام عزیزوں کی معاشی امداد کرتے رہنا ان کا معمول تھا۔ خود صالحہ بہن کے اولاد نہ تھی۔ ایک بچی پیدا ہو کر جلد ہی انتقال کر گئی تھی۔ اس کے بعد وہ اولاد سے محروم رہیں لیکن صالحہ بہن نے اس کمی کو اس طرح پورا کیا کہ ڈاکٹر صاحب کی بھانجیوں بھتیجیوں اور بھانجوں اور بھتیجوں اور دیگر رشتہ داروں کو دیہات سے بلا کر ان کی پرورش و تعلیم بلا مبالغہ بالکل اپنی اولاد کی طرح کی اور ان کو رائج الوقت علم و ہنر سے آراستہ و پیراستہ کیا۔ نیز مناسب عمر میں آنے پر ان کی شادیاں کر دیں۔ رشتہ دار ہی کیا، ان کے نوکروں کے بچّے بھی ان کے گھر سے بی اے، ایم اے کر کے نکلتے رہے۔ اس طرح خدا معلوم صالحہ بہن نے کتنے دلوں کو علم کی روشنی سے منوّر کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کی ایک بھانجی کو اپنے ساتھ رکھ کر اعلا سے اعلا تعلیم دلائی۔ چنانچہ وہ ایم اے، پی ایچ ڈی ہیں۔ اور صالحہ بہن سے اس قدر وابستہ ہیں کہ ان کی خدمت کو اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتی ہیں۔ صالحہ بہن بھی ان کو اپنی بیٹی مانتی اور کہتی رہیں۔ صالحہ بہن کی جدائی میں ان کا کیا حال ہوگا، تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ابھی یہاں حاضر ہونے سے کچھ ہی دیر پہلے ڈاکیہ نے ان صاحبزادی کا بھیجا ہوا ایک پیکٹ دیا جس میں صالحہ بہن کے چہلم کی قرآن خوانی اور مجلسِ عزا کے مطبوعہ کارڈ آئے ہیں۔ گویا اب یہی صاحبزادی صالحہ بہن کے فردِ خاندان کی حیثیت سے سب کام انجام دے رہی ہیں۔

صالحہ بہن طبیعتاً نہایت خوش مزاج، خوش خلق، عالی نفس، کنبہ پرور، رحم دل اور انسانی ہمدردی سے مملو تھیں۔ اسی وجہ سے نہ صرف اپنے خاندان میں بلکہ تمام حلقۂ ملاقات میں، جو وسیع سے وسیع تر ہوتا رہا، نہایت ہر دل عزیز، مقبول اور باعزت رہیں۔ خانگی زندگی میں بھی

اور سیاسی خیالات میں بھی ڈاکٹر عابد حسین صاحب کے اصول، نظریات اور طریقۂ عمل میں ہر حیثیت سے ان کی شریک اور ساتھی رہیں اور اپنی خواہشات اور طرزِ زندگی کو ان کی طرزِ زندگی میں ضم کیے رہیں۔ اسی طرح انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے خاندان والوں کا بھی خاص خیال رکھا۔ ہر ایک کے ساتھ محبت، سچی ہمدردی اور یگانگت کا برتاو رکھا۔ چنانچہ ان کا گھر اُن کی سسرال والوں کے لیے ایک قسم کا ملجا و ماویٰ بنا رہا۔ اور وہ سب لوگ صالحہ بہن کے پرخلوص بلند کردار سے خوش، مطمئن اور ان کے مداح رہے۔ غرض کہ صالحہ بہن اپنے مثالی کردار کی بدولت نہ صرف اپنے خاندان میں بلکہ ڈاکٹر صاحب کے خاندان والوں میں بھی سب کی آئیڈیل مانی جاتی رہیں۔ بلکہ خاص کر ڈاکٹر صاحب کے خاندان کے افراد صالحہ بہن کو اپنا سچا خیر خواہ اور ہمدرد مانتے، اہم معاملات میں ان ہی سے مشورہ کرتے۔ ان ہی سے مدد چاہتے، ان ہی کی رائے پر عمل کرتے اور ان ہی کے گن گاتے رہے۔ یہ سب صالحہ بہن کی خوش خُلقی، ہمہ گیر محبت خلوص، ایثار پسندی، خاندانی پاسداری اور علو اخلاق کا نتیجہ ہے۔

بس ہم دونوں میاں بیوی بھی صالحہ بہن کی اسی ہمہ گیر محبت کے دامن میں آگئے اور اس استحکام سے کہ پاکستان اور ہندستان علاحدہ علاحدہ ملک بن جانے پر بھی اس محبت میں بال نہیں پڑا۔ پاکستان کا وجود میں آنا برِ صغیر کی تاریخ میں ایک عظیم انقلاب تھا۔ یہ ایک سیلاب تھا جس کی زد سے کتنے ہی بسے بسائے گھر اِدھر سے اُدھر ہو گئے۔ گھرانوں کے افراد تتر بتر ہو گئے لیکن ہماری باہمی محبت کی دنیا اس پورے سیلاب سے بالکل غیر متاثر رہی۔ ایک مطبوعہ کتاب میں صالحہ بہن نے اس یگانگت کو اس طرح بیان کیا ہے:

> "۱۹۴۷ء کا پُر آشوب زمانہ تھا۔ ہندستان تقسیم ہوا۔ بیشتر سرکاری مسلمان ملازموں نے اپنی خدمات پاکستان کو پیش کر دیں۔ علی رضا بھی انھیں میں تھے۔ ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ پانی پت کے سیکڑوں اور دلّی وغیرہ کے پچاسوں قریبی دوستوں کے ساتھ یہ عزیز ترین دوست بھی جُدا ہو گئے۔ مگر جب دل ملے ہوئے ہوں تو فاصلے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اور اس پینتالیس سال میں ہم کچھ اور قریب آگئے ہیں کتنی بار وہ ہندستان آئے ہیں۔ علی رضا زیادہ تر سرکاری کانفرنسوں میں آتے اور سرکاری مہمان ہوتے۔ البتہ ظہیر سرکاری مہمان خانہ چھوڑ کر میرے پاس رہتیں۔ بعض مرتبہ دونوں نے میرے ہاں قیام کیا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے

اور بچوں کے اصرار، محبت اور کشش نے سالِ گذشتہ (۱۹۸۳ء) اس عمر، اس صحت اور ان فاصلوں کے باوجود جو ہندستان اور امریکہ میں ہیں مجھے امریکہ پہنچا دیا ہے۔"

صالحہ بہن پچاس سے اُوپر کتابوں کی مصنفہ تھیں۔ ان کی زندگی بچپنے سے لے کر آخر عمر تک لکھنے میں گزری وہ اپنی خود نوشت سوانح حیات "سلسلۂ روز و شب" میں رقم طراز ہیں کہ:

"ذوقِ خامہ فرسائی مجھے ورثہ میں ملا۔ . . . . . میرے والد مرحوم مشہور لکھنے والے تھے۔ قومی مسائل، سوشل مسئلوں، سیاسی حالات پر، نیز علمی اور اصلاحی مضامین لکھتے تھے . . . . . بڑے چچا خواجہ غلام حسنین مذہبی اور علمی مضامین اور کتابیں لکھتے تھے۔ خواجہ غلام السیدین کا نام اردو اور انگلش مصنف اور ادیب کی حیثیت سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ لکھنے کا اس قدر شوق اور مہارت تھی کہ ہر وقت ہر جگہ لکھ سکتے تھے . . . . . . لکھنے کا شوق صرف مردوں ہی میں نہ تھا۔ میری ایک پھوپی نے میری پیدائش سے پہلے ظلّ السلطان وغیرہ میں مضمون لکھے تھے۔ بڑی بہن فاطمہ زیدی بہت اچھی شاعرہ تھیں۔ منجھلی بہن سیدہ خاتون رسالوں میں مضمون بھی لکھتی تھیں اور فارسی کی ایک کتاب "دوستداران بشر" کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ . . . . شاید ۸ سال کی یا اس سے کچھ کم زیادہ عمر ہوگی جب سے ہم نے بزعم خود باقاعدہ مضمون نگاری شروع کر دی تھی۔"

اسی کتاب میں اپنی تخلیقات کی اشاعت کی ابتدا کے متعلق لکھتی ہیں کہ:

"۱۹۴۱ء میں عابد صاحب اور بھائی جان کے مشورہ سے میں نے اپنے افسانوں کا پہلا مجموعہ مرتب کیا جس میں چھ افسانے تھے اور چھ ڈرامے۔ نام عابد صاحب نے رکھا "نقشِ اوّل" دیباچہ مولوی عبدالحق نے تحریر کیا جس میں تعریف اور ہمت افزائی کی گئی . . . . یہ تھی میری ان چالیس شائع شدہ کتابوں کی بنیادی اینٹ جو آج تک میری الماری کی زینت ہے۔"

غرض کہ صالحہ بہن نے کہانیاں، افسانے، ڈرامے، ناول، نیز مذہبی اور سماجی کتابیں، ہر صنفِ ادب پر خامہ فرسائی کی اور نہایت کامیاب طریقہ پر یہ خود نوشت سوانح عمری یعنی

"سلسلۂ روز و شب" اوائل ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ وہ اس کے بعد بھی لکھتی رہیں اور اس طرح ان کی تعداد اگر پچاس سے اوپر نہیں تو قریب ضرور پہنچ چکی ہوگی۔ غیر شائع شدہ لکھے ہوئے مواد کے متعلق اسی "سلسلۂ روز و شب" میں لکھتی ہیں :

"میری چالیس بیالیس شائع شدہ کتابوں کے علاوہ سیکڑوں تقریریں، فیچر، خاکے، کہانیاں، ڈرامے وغیرہ جو ریڈیو، رسالوں، جلسوں وغیرہ کے لیے لکھے گئے ہیں۔ جو یا تو شائع ہوئے ہی نہیں یا صرف رسالوں میں چھپے ہیں۔ ان میں ہلکے پھلکے مضامین بھی ہیں، مزاحیہ بھی، طنزیہ بھی، سنجیدہ بھی اور ادبی بھی، اصلاحی اور مذہبی بھی اور سوانحی بھی۔ بہت سے ضائع ہو گئے ہیں پھر بھی ابھی کئی الماریاں ان کا پیوں، کاغذوں اور مسودوں سے بھری ہوئی ہیں کہ اگر میرے بعد کوئی اللہ کا بندہ (خدا اس پر رحم کرے) چاہے تو پندرہ بیس کتابیں اس سے مرتب کر سکتا ہے اور اس میں رطب و یابس کا کرشمہ دیکھا جا سکتا ہے۔"

حد ہے کہ صالحہ بہن اپنی ۷۴ سالہ عمر کے آخری ایام تک تصنیف و تالیف کے ذریعہ اردو کی خدمت کرتی رہیں۔ ہندستان کے اردو بورڈ، نیز غالب اکادمی کی رکن رہیں۔ میر انیس کی صد سالہ یادگار منانے والی انیس کمیٹی کی رکن رہیں۔ اس موقع پر انھوں نے جا بجا تقریبات میں مقالے پڑھے اور کمیٹی کی فرمائش پر انیس کے مرثیوں کے انتخاب تیار کیے جو شائع کیے گئے۔

ان کی خدمات کے اعتراف میں ہندستان کی حکومت باوجود کہ وہاں کی سرکاری زبان ہندی ہے۔ انھیں ۱۹۸۳ء میں "پدم شری" کا اعلا خطاب عطا کیا اور ابھی اکتوبر ۱۹۸۷ء میں غالب اکادمی کی طرف سے غالب ایوارڈ دیا گیا۔

اپنے سفر آخرت سے صرف ایک ہفتہ پہلے انھوں نے کراچی میں بزم آمنہ کی طرف سے شائع کیے جانے والے مجلّہ "صدائے آمنہ" میں شامل کیے جانے کے لیے جناب فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہا وعلیٰ اولادھا الکرام پر ایک طویل مضمون بھیجا جس کے ساتھ خط میں بھی لکھا کہ اب شاید زندگی میں کوئی بڑا مضمون نہ لکھ سکوں گی۔

۸ جنوری ۱۹۸۸ء کی منحوس صبح کو سویرے ہی امریکہ سے ہماری منجھلی بیٹی عذرا سلمہا کا جس کو صالحہ بہن اپنی بیٹی کہتی تھیں، فون آیا کہ ابھی ابھی نئی دہلی میں صالحہ خالہ جان کا انتقال ہو گیا ہے۔ ہچکیوں کے باعث بچی کچھ اور نہ کہہ سکی۔ یہ خبر کیا تھی ہمارے لیے ایک صاعقہ تھی۔

اب ہمارے لیے صرف دہلی ہی کیا پورا ہندستان سونا سونا لگ رہا تھا۔ عابد صاحب دسمبر ۱۹۷۸ء میں رخصت ہو چکے تھے۔ لے دے کے دل بستگی کا ایک سہارا صالحہ بہن کا تھا جس سے خاصی ڈھارس تھی۔ دہلی جانے میں ایک کشش تھی۔ ان سے ملنے میں عزت محسوس ہوتی تھی۔ ان کے اس دنیا سے چلے جانے سے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ برِ صغیر میں اب کوئی با اعتماد، سچا، پُرخلوص دوست بلکہ سرپرست اور ایسا ملنے والا جس سے ملنا باعثِ فخر محسوس ہو نہیں رہا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

(یہ مضمون پاکستان میں انجمن ترقی اردو کے جلسے میں پڑھا گیا۔)

عارف نقوی

اچھّی امّاں

یہ عجیب صورت حال ہے کہ آج میں اچھّی امّاں کے بارے میں ایک مضمون لکھنا چاہتا ہوں، وہ اچھّی امّاں جو ساری زندگی دوسروں کے لیے لکھتی رہیں۔ وہ اچھّی امّاں جن کو کبھی میں اپنا کوئی مضمون یا کہانی سناتا یا پڑھواتا اور وہ میری ناتجربہ کاری اور نوعمری کے باوجود سنجیدگی سے میری تخلیق پر اپنی رائے دیتیں تو مجھے کتنی خوشی کتنی حیرت اور کتنا فخر کا احساس ہوتا تھا کہ اتنی بڑی ادیبہ میری تخلیق کو اس قابل سمجھ رہی ہے کہ اُس پر اپنی رائے کا اظہار کر رہی ہیں۔ اور اسی وجہ سے آج میرا دل چاہتا ہے کہ میں اچھّی امّاں پر ایک مضمون لکھوں۔ مگر کیا یہ ایک مضمون اُن کی شخصیت کو اپنے اندر سمیٹ سکے گا؟

مشکل یہ ہے کہ بڑی شخصیات اتنی کثیر الجہات ہوتی ہیں کہ اکثر اُن کی شخصیت کی مکمّل تصویر سوانح عمری میں بھی پیش کرنا دشوار ہوتا ہے۔ اچھّی امّاں کی شخصیت بھی ایسی تھی بلکہ ہے، کیونکہ جسم تو شخصیت کا صرف ایک حصّہ ہوتا ہے، اور جسم نظروں سے اُوجھل ہو جانے کے باوجود اُن کی شخصیت ابھی باقی ہے۔ یہ صرف میرا خیال نہیں۔ ذرا اُن لوگوں سے پوچھیے جو اب بھی اُن کی شخصیت کو اپنے نزدیک محسوس کر رہے ہیں۔ اُن کی ناولوں اور کہانیوں کے ذریعے صالحہ عابد حسین آج بھی اُن کے ساتھ ہیں۔ اسی طرح اچھّی امّاں کی شخصیت بھی ابھی باقی ہے۔ ذرا عابد وِلا جائیے اور دیکھیے کہ ڈاکٹر صغرا مہدی کی شخصیت میں اُن کی انفرادیت کے ساتھ ساتھ اچھّی امّاں کی شخصیت کی جھلک بھی محسوس ہوتی ہے۔ ڈرائنگ روم کتابوں کی الماریوں، اور تمام ماحول میں اچھّی امّاں کو دیکھا نہیں تو محسوس ضرور کیا جا سکتا ہے۔ یہ اچھّی

امّاں کی شخصیت کا احساس ہے۔ صالحہ عابد حسین کی شخصیت کا نہیں۔ تو کیا یہ الگ الگ شخصیات ہیں۔ جی ہاں صرف یہی نہیں۔

صالحہ عابد حسین — ایک ادیبہ — اچھی امّاں — محبت وشفقت کا ایک چھتنار درخت — بیگم عابد حسین — ایثار و وفا کا پیکر — صالحہ باجی — غم گساری و وضع داری کی تصویر۔ اور نہ جانے کتنی جہات تھیں اُن کی شخصیت میں۔ ایک تراشیدہ ہیرے کی طرح جس پر جس سمت سے روشنی پڑے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہی اُس کی شکل ہے۔ اس لیے یہ بڑا دشوار مرحلہ ہے کہ اس کثیر الجہات ہیرے پر اس زاویے سے روشنی ڈالی جائے کہ اس کی تمام جہات منوّر ہو سکیں۔ اور وہ بھی اس صورت میں جب یہ کام مجھ جیسا نومشق کرنا چاہتا ہو۔ مگر میں اپنے طور پر خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے یہ کام کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میرے وجود کو علم وادب کے نور سے منوّر کرنے والے چراغوں میں سے ایک بڑا چراغ اُن کی شخصیت تھی۔

مجھے یاد نہیں کہ میں اچھی امّاں سے کب متاثر ہونا شروع ہوا۔ بحیثیت ادیبہ تو اُن سے متاثر ہونے کا سلسلہ ہوش سنبھالنے کے کافی بعد شروع ہوا، اس سے پہلے تو ایک شفیق بزرگ کی صورت یاد کے آئینے میں ابھرتی ہے۔ پُر نور چہرہ، محبتوں کی پھوار برساتی آنکھیں اور پاکیزہ مسکراہٹ جی چاہتا تھا گھنٹوں بیٹھے اُنھیں دیکھتے رہو۔ اُن سے باتیں کرتے رہو۔ مگر پتا نہیں کیوں بچپن کے ابتدائی ایام میں اُن کی ادبی حیثیت نے اتنا مرعوب کر دیا تھا کہ یہ احساس ہوتا تھا کہ ہم بچوں سے بات کرنے میں اُنھیں بوریت ہوتی ہوگی، اس لیے ہم آتے اور اُنھیں آداب کر کے اِدھر اُدھر کھسک جاتے۔ پھر جب ذرا بڑے ہوئے اور اچھی امّاں نے ملاقاتوں کے دوران ہم سے ہماری پڑھائی لکھائی کے سلسلے میں دریافت کرنا شروع کیا ہمیں مشورے دینے شروع کیے تو آہستہ آہستہ یہ رُعب ختم ہوا۔ اب ہمیں محسوس ہوتا کہ جیسے وہ صرف ہماری اچھی امّاں ہیں۔ میں دہلی میں نہیں رہتا تھا۔ اس لیے سال میں ایک دو بار ہی ان سے ملنے کا موقع ملتا تھا۔ ہم اُن سے اپنے تمام مسائل پر بات چیت کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں اس بات پر بہت رویا تھا کہ اچھی امّاں مجھ سے زیادہ دہلی میں رہنے والے میرے رشتے کے بھائی بہنوں سے زیادہ محبت کرتی ہیں۔ اُس وقت تو مجھے بہلا دیا گیا۔ مگر بعد میں یہ بات میری سمجھ میں آگئی کہ قریب رہنے کی وجہ سے وہ اُن کی سرگرمیوں میں شریک

تھیں۔ اور دوسری بات یہ تھی کہ دہلی میں رہنے والے بچوں میں لڑکیاں زیادہ تھیں اور لڑکیوں کے مسائل اور حالات تو اُن کی تخلیقات کا موضوع تھے۔ یوں تو ہم سب لڑکے لڑکیاں اُنھیں اپنی سرگرمیوں سے آگاہ رکھتے اور اپنی کارگزاریوں کو اُن کی ناراضگی اور خوشی کے پیمانے سے تولتے، گویا وہ سب کے لیے ایک کسوٹی تھیں۔ اور ہمارے ہی لیے کیا ہم سے بڑے بھائی بہنوں بلکہ ہمارے درمیانی پیڑھی کے بزرگوں کے لیے بھی وہ یہی حیثیت رکھتی تھیں۔ ازدواجی مسائل ہوں یا سماجی مراحل، سب اچھی اماں سے آکر اپنا اپنا حالِ دل کہتے اور وہ ایک وشال ساگر کی طرح ان مسائل کی چھوٹی چھوٹی ندیوں کو اپنے اندر سمو کر صبر و سکون کے ساتھ اُن پر غور کرتیں اور سب کو مشورے دیتیں۔ ہم چھوٹے بچوں سے لے کر عمر رسیدہ بزرگوں پر مشتمل اچھی اماں کا یہ حلقہ کتنا بڑا تھا اس کا اندازہ مجھے بہت دن تک نہیں ہو سکا۔ مگر آج لگتا ہے کہ شاید دہلی۔ علی گڑھ۔ داعی پور، لکھنؤ، بمبئی، پانی پت، پاکستان، امریکہ اور کناڈا تک یہ حلقہ پھیلا ہوا تھا اور براہ راست ان کی شخصیت کے سحر سے متاثر تھا۔ اور جس پر اُن کی محبت اور شفقت کی بارش ہوتی تھی۔ اور اس سے بھی وسیع حلقہ وہ تھا بلکہ ہے جو اُن کی تخلیقات سے متاثر ہو کر اُن کا گرویدہ ہوا۔

اُن کی ادبی حیثیت پر قلم اٹھانا ابھی میری دسترس سے باہر ہے۔ لیکن یہ اُن کی شخصیت کی ایک اہم جہت ہے اور میں اتنا تو ضرور کہہ سکتا ہوں کہ متوسط طبقے کی لڑکیوں اور عورتوں (خصوصاً مسلمان) کے مسائل اور تیز رفتاری سے بدلتی ہوئی زندگی میں اُن کی ذہنی، جسمانی اور سماجی کشمکش کا جو عرفان اُنھیں تھا اور جس سادگی اور خلوص سے وہ اُن کے مسائل کو پیش کرتی تھیں۔ وہ ایک بڑا کام ہے۔ بلکہ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ آیندہ کوئی اسکالر اگر اس دور میں خواتین کے مسائل اور ان کی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہے گا تو صالحہ عابد حسین کے ناول بھی اس کے لیے ایک اہم ذریعہ ثابت ہوں گے۔

میں اپنے ادبی سفر میں سب سے پہلے پریم چند سے متاثر ہوا اس لیے جب بعد میں اچھی اماں کے ناول اور کہانیاں پڑھیں تو احساس ہوا کہ اُن کا اسلوب بھی پریم چند کی طرح سیدھا سادہ اور پُر خلوص ہے۔ اور یہ بات دونوں کے لیے مشترکہ طور پر کہی جا سکتی ہے کہ دونوں ہی کی تخلیقات میں ان کی شخصیات کی سادگی اور خلوص جلوہ گر تھا۔ میں یہ اعتراف پہلے ہی کر چکا ہوں کہ ان کی ادبی شخصیت کا محاسبہ میرے بس کی بات نہیں۔ اس فریضے کو انجام

دینے کے لیے بہت سے تجربے کار اور موقر قلم کار موجود ہیں۔ مگر میری خواہش ہے کہ اُن کی سوانح حیات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اُن کی تخلیقات کا عہد بہ عہد مطالعہ کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کس طرح اُنھوں نے اپنی ذات کو اپنی تخلیقات میں بتدریج سمویا اور آخر کار معدوم کر دیا۔ ایلیٹ نے بودلیئر کے بارے میں لکھا ہے کہ "وہ ایسے لوگوں میں تھا جو عظیم قوت رکھتے ہیں۔ لیکن محض "تکلیف اُٹھانے کی" قوت ـــ وہ نہ تو تکلیف سے فرار حاصل کر سکا اور نہ اس سے ماورا ہو سکا۔ لہٰذا اس نے اپنی تکلیف کو اپنی ذات میں "سمو لیا" مگر اس بے انتہا منفعل قوت اور ادراک سے، جس کو کوئی درد بگاڑ نہ سکتا تھا" صالحہ عابد حسین میں بھی یہ عظیم قوت تھی۔ انھوں نے بھی اپنی تکالیف کو اپنی ذات میں سمو لیا تھا اور اپنے پرایوں کے درد و غم کو گلے لگا کر منفعل قوت اور ادراک سے اپنی تخلیقات میں اُن کی عکاسی کو اپنا مقصدِ زیست بنا لیا تھا۔

آج جب میں اچھی امّاں کی پوری شخصیت پر غور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس عبوری دور میں جب اقدار کی شکست و ریخت نے ہماری نسل کو ایک دوراہے پر لا کر کھڑا کیا ہے۔ ہم پرانی اقدار سے کنارہ کش ہو چکے ہیں اور نئی اقدار کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اس صورت حال میں اگر ہم یہ چاہیں کہ اپنے بزرگوں میں پرانی اقدار کا کوئی ایسا نمونہ دیکھیں جس نے عملی زندگی میں اُن اقدار کو برتا تو صالحہ عابد حسین کی شخصیت ہمارے لیے ایک مثالی حیثیت میں سامنے آتی ہے۔ صالح روایات اور اقدار کا نمونہ دکھائی دیتا ہے۔ اور اگر اپنے لیے راستے کی تلاش میں ہم اُن کی شخصیت پر ذرا اور باریک بینی سے غور کریں تو احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی اپنے بزرگوں کی بہت سی فرسودہ روایات و اقدار سے انحراف کیا لیکن اس طرح کہ اپنی جڑوں سے رشتہ منقطع نہیں کیا، ترقی یافتہ زندگی کی کار آمد اور مفید تبدیلیوں کو لبیک کہا اور قدیم روایات کو یکسر فرسودہ اور OUT DATED کہہ کر نظر انداز نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی شخصیت میں ایک توازن ایک ٹھہراؤ تھا اور اسی توازن اور ٹھہراؤ کی ہماری نسل کو آج ضرورت ہے۔

صفیہ ملک

صالحہ عابد حسین سے ملاقات

کہتے ہیں مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں یہ بات بارہا آپ کے تجربے میں بھی آئی ہوگی۔ لیکن گذشتہ دنوں مجھے یہ احساس ہوا کہ ایک مہمان دوسرے مہمان کی خبر بھی دیتا ہے۔

ہوا یوں کہ ایک خاتون ملنے آئیں۔ کافی دنوں بعد ملاقات ہوئی تھی۔ اس لیے میں نے سامنے دھری فائلوں کو سمیٹ کر ایک طرف رکھا اور پوری توجہ ان کی طرف مرکوز کردی۔ گفتگو کے اختتام پر انھوں نے انکشاف کیا کہ پرسوں ایک ایسی خاتون سے ان کی ملاقات ہوئی ہے جو پاکستان آئی ہوئی ہیں اور ایک ہفتے بعد جانے والی ہیں۔ میرے کان کھڑے ہوگئے۔ نام پوچھا تو استعجاب کی ایک لہر نے میرا احاطہ کرلیا کیونکہ نام بہت اہم تھا۔ لیکن ان کی آمد کی اطلاع شاید اخبارات کو اب تک نہ ملی تھی۔ یا پھر اس میں موصوفہ کی بے نیازی کو دخل تھا۔ عموماً ہندستان سے آنے والے ادیبوں کی خبر اُن کے پہنچنے سے قبل لگ جاتی ہے اور "اِن" کی روانگی قریب ہے لیکن گنے چُنے لوگوں کو ہی خبر ہے۔

یہ نام ایسا تھا جو اپنی تحریر کے ذریعے پاکستانی عورت کے دل سے بہت قریب تھا۔ اُس کے دُکھ اُس کے سُکھ، اس کے مسائل انھوں نے اکثر نوکِ قلم سے سلجھائے تھے۔ میرے ذہن میں مختلف ادبی رسائل میں چھپنے والے ان کے متعدد افسانے روشن ہوگئے۔ پھر اس معزز و محترم ہستی کا خیال آیا جو ہم سے بچھڑ گئی ہے۔ جس نے موصوفہ کے ساتھ زندگی کا ایک طویل سفر کیا تھا۔

تب میں نے گراہم بیل کو دعا دیتے ہوئے نمبر ڈائل کیے۔ معلوم ہوا "اس وقت گھر پر نہیں ہیں

کل صبح فون کیجیے ـ" جی کو ڈھارس بندھی کہ کل صبح کون سی دُور ہے۔

اور پھر ایک روز میرا رُخ طارق روڈ کی طرف تھا۔ تمام نشانیاں چیک کر کے میں نے ایک مکان کی کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ دروازہ کھلا۔ میں نے اپنا تعارف کروایا تو مجھے ایک کمرے میں بٹھایا گیا۔ تنہائی پاکر میں نے دیواروں پر آویزاں تصاویر پر نظریں دوڑائیں۔ ایک لمحہ کو ذہن الجھا لیکن پھر یہ سوچ کر اطمینان کا سانس لیا کہ محترم خاتون بھی اس گھر کی مہمان ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد اندرونی دروازے سے سفید ساڑھی میں ملبوس ایک خاتون داخل ہوئیں۔ دُوہرے بدن کی اس عام سے نین نقش والی خاتون کے چہرے پر سب سے نمایاں ایک عجیب سا سکون ایک عجیب سا اطمینان تھا۔ جس کی اتھاہ میں اترنے کے لیے کچھ وقت چاہیے تھا۔ جی ہاں! یہ وہی خاتون ہیں جن کی کشش مجھے یہاں کھینچ لائی تھی ـ یہ ہیں صالحہ عابد حسین صاحبہ!

میں نے سلام کیا۔ انھوں نے دعا دی۔ پھر انھوں نے تواضع کے لیے پوچھا لیکن میں نے معذرت کے ساتھ کہا۔ "بہتر یہ ہے کہ سوال جواب کا سلسلہ شروع کیا جائے تا کہ فوٹوگرافر صاحب اپنا کام ختم کر کے جا سکیں۔"

انھوں نے مسکراتے ہوئے شفقت آمیز لہجے میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ شروع کیجیے۔"

"آپ پہلی بار پاکستان آئی ہیں نا؟"

"نہیں ـ پہلی بار ۵۳ء میں آئی تھی۔"

میں نے سوچا یہاں میں بے قصور ہوں۔ اس لیے مزید اطمینان کے لیے پوچھا "اس کے بعد کب آئی تھیں؟"

"اس کے بعد چار پانچ بار پاکستان آئی لیکن اب کے گیارہ سال بعد آئی ہوں۔"

"آپ کو ہمارا شہر کیسا لگا؟" ـ اپنے شہر کی محبت نے جوش مارا اور میں نے بڑے مان سے پوچھا۔

جواب ملا ـ "پہلے بھی دیکھا تھا۔ لیکن اب بہت بڑا ہو گیا ہے۔ بڑا اچھا شہر ہے ..... جیسے کہ بڑے شہر ہوتے ہیں۔ آپ اُسے اچھا شہر کہیے یا جو کچھ۔"

تب میں نے سوچا۔ کیا ضروری ہے کہ میری جائے پیدائش سے انھیں بھی لگاؤ ہو۔ اس لیے

مشترکہ دلچسپیوں پر گفتگو ہی زیادہ بہتر ہے۔

"آپ نے کب سے لکھنا شروع کیا؟"

"آٹھ دس سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا تھا۔"

"کچھ یاد ہے کیا لکھا تھا؟"

"چھوٹی عمر میں جاسوسی رسالے پڑھتی تھی تو شاید اسی کا اثر ہوا کہ میں نے "انسپکٹر عاصم علی" لکھا۔ لیکن اس وقت اپنے طور پر تو ناول لکھا لیکن خدا جانے کیا تھا؟"

"اسے چھپوایا تھا؟"

"نہیں۔ صندوقچی میں چھپا لیا تھا۔"

"سب سے پہلے چھپنے والی کون سی تحریر تھی؟"

"۲۸ء میں ایک کہانی رسالہ "نور جہاں" میں شائع ہوئی۔ "لمبی ڈاڑھی والا بوڑھا پوپ" یہ ایک انگریزی کہانی سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی۔"

میرا ذہن صالحہ صاحبہ کے گھرانے کی طرف گیا تو میں نے پوچھا۔ "کہانی چھپی دیکھ کر آپ کے بڑوں کو تو خوشی ہوئی ہوگی؟"

"مجھے بھی خوشی ہوئی اور بڑوں کو بھی ضرور ہوئی ہوگی۔ لیکن اتنی سی عمر میں کہانی شائع ہونے پر ہم عمر اتنا ٹیز کرتے تھے کہ ساری خوشی گھسیاہٹ میں تبدیل ہوگئی۔"

"۳۰ء کی بات ہے۔" "اس کے بعد کی کوئی سنجیدہ تحریر جو آپ کو یاد ہو؟"

"۳۰ء کی بات ہے۔ ایک ہی سال میں والدہ اور بہن کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت میری عمر چودہ سال تھی۔ اس سے متاثر ہو کر میں نے ایک ناول لکھا "حسنِ اتفاق"۔ یہ چھپا نہیں تھا اور اسے میرے بھائی سیدین صاحب کے سوا کسی نے دیکھا نہیں تھا۔ میرے خیال میں یہ میری پہلی غیر شعوری کوشش تھی فن کے ذریعے غم کو سہارنے کی۔"

"کیا آپ نے اس مسودے کو محفوظ رکھا؟"

"سنبھال کے تو رکھا تھا لیکن بہت سی چیزوں کے ساتھ پانی پت میں ختم ہوگیا۔"

پانی پت کے ذکر پر مولانا حالی یاد آئے۔ لیجیے اس مقام پر آپ کو بتاتی چلوں کہ صالحہ عابد حسین صاحبہ مولانا الطاف حسین حالی کی پر نواسی ہیں، والد خواجہ غلام الثقلین اور بھائی سیدین صاحب بھی اردو ادب کے اہم نام ہیں۔ ان کے گھرانے کے اکثر مرد ادیب اور عالم گزرے ہیں۔ لیکن ان کی بہنیں

اور پھوپھیاں بھی لکھا کرتی تھیں ___ پھر اس علم وادب کی پروردہ بیٹی کی شادی جامعہ ملیہ دہلی کے ڈاکٹر عابد حسین سے ہو گئی۔ اور یوں علم وادب کے دھارے ساتھ ساتھ بہنے لگے۔

صالحہ عابد حسین صاحبہ ماضی کے اوراق الٹ رہی تھیں۔ میں نے اسی نسبت سے ایک سوال کیا۔ جس کے جواب میں انھوں نے کہا۔

"میں "تہذیب" ___ "نورجہاں" ___ "سہیلی" ___ اور "عصمت" میں چھپتی رہی یہ عورتوں کے رسالے تھے۔ اس کے بعد دیگر پرچوں میں بھی لکھنا شروع کیا۔ لیکن کتابیں شادی کے بعد شائع ہوئیں۔ شادی ۳۳ء میں ہوئی اور ۳۹ء میں مجموعہ "نقش اوّل" شائع ہوا جس میں چھپے افسانے اور چھپے ڈرامے تھے۔ اس کا دیباچہ مولوی عبدالحق نے لکھا تھا۔"

صالحہ عابد حسین کی تصانیف کے تنوع کا اندازہ اس سے کیجیے کہ انھوں نے ۸ ناول ۵ افسانوں کے مجموعے ۴ سوانح۔ ۳ ڈراموں کے مجموعے۔ ، کتابیں بچوں کے لیے لکھیں اور کئی کتابیں مرتّب کیں۔ ان کتابوں کے حوالے سے میں نے ایک سوال کیا جس کے جواب میں انھوں نے کہا۔

"میں نے آٹھ دس سال کی عمر سے لکھنا شروع کیا۔ اب تین کم ستّر برس کی ہوں ___ پہلے تو گھرداری ___ سوشل تعلقات اور سوشل ورک بھی کرتی تھی۔ پھر بیماری کی وجہ سے سوشل ورک چھوڑ دیا۔ گھر کی ذمہ داریاں اور اپنی بیماریاں ساتھ ساتھ ہیں۔ میں نے بڑی بڑی بیماریاں جھیلی ہیں۔ اب بھی بیمار ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ لکھتی رہی ہوں۔ میں خود کو سچّا فنکار نہیں کہتی۔ لیکن سچّا جذبہ وقت نکال لیتا ہے۔ میں نے سخت سے سخت بیماری کی حالت میں لکھا۔ سفر میں حضر میں شدید مصروفیت میں لکھا ضرور ہے۔ آپ اسے میری خوبی کہیں یا خرابی میں بہت تیز لکھتی ہوں بالکل ایسے ہی جیسے آپ اس وقت لکھ رہی ہیں ___ پھر میں نقل بھی خود کرتی ہوں۔ کیونکہ آمد تیز ہوتی ہے۔ لیکن سوچنے میں وقت لیتی ہوں۔ ناول کو سوچنے میں کافی وقت لگتا ہے جب تک خاکہ تیار نہ ہو جائے۔ ناول لکھنے نہیں بیٹھتی ہوں اور جب لکھنے بیٹھتی ہوں کردار خود قلم سے نکل کر شکل بنا لیتے ہیں۔"

"ریڈیو ٹی وی کے لیے بھی آپ نے لکھا ہے؟"

"ٹی وی تو ہمارے یہاں اتنا ترقی یافتہ نہیں ہے لیکن ریڈیو کے لیے میں نے بہت لکھا ہے۔ ۲۶ء میں جب پہلا ریڈیو اسٹیشن دہلی میں بنا تھا میں تقریریں کرتی رہی ہوں۔ ریڈیو کے لیے میں نے ڈرامے، فیچر سب ہی لکھے ہیں۔ اب کم ہی جاتی ہوں۔ لیکن عورتوں کے پروگرام میں اب بھی چلی جاتی ہوں۔"

"کیا آپ فرمائش پر بھی افسانہ لکھ دیتی ہیں؟"

"عام طور پر فرمائش پر افسانہ نہیں لکھتی ہوں۔ لیکن ریڈیو سے فرمائش آجائے اور کچھ لکھا ہوا ہو تو روائیز کر کے بھیج دیتی ہوں۔"

"آپ کے بہت سے شوق تھے۔ یہ بتایئے سب سے اہم کون سا شوق ہے؟"

"سوشل ورک — ملنا جلنا — سینا کاڑھنا — گھرداری یہ سب شوق تو اب ختم ہو گئے ہیں۔ اور دو ہی شوق رہ گئے ہیں لکھنا اور پڑھنا — اور پڑھنا تو زندگی ہے۔ اس لیے سوچتی ہوں کہ اب بھی اس گرتی صحت اور اس عمر میں لکھ سکتی ہوں۔ تو میرے خیال میں اصلی کام یہی تھا جس کے لیے شاید قدرت نے مجھے اس دنیا میں بھیجا ہے۔"

"آپ کے شوہر ڈاکٹر عابد حسین بڑی قدر آور شخصیت تھے ان کی وجہ سے آپ کے لکھنے میں کوئی رکاوٹ تو نہیں ہوئی؟"

"میں نے اتنا جو کچھ لکھا ہے اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ شوہر بہت بڑے عالم ادیب لیکن سچے رفیق تھے۔ ان کی وجہ سے کبھی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی بلکہ اُپج اور مدد ہی ملی۔ یوں بھی میرے استاد دو ہی ہیں۔ شوہر اور بھائی سیدین صاحب اور میں ان کی ہی بات مانتی تھی۔ اور کسی کی سنتی بھی نہیں تھی۔"

"جس زمانے میں آپ نے لکھنا شروع کیا 'ترقی پسند تحریک' اپنے عروج پر تھی لیکن کیا وجہ ہے کہ آپ کبھی باقاعدہ کسی تحریک کے ساتھ وابستہ نہیں رہیں؟"

"یہ صحیح ہے کہ میں کبھی کسی تحریک کے ساتھ وابستہ نہیں رہی جب کہ ہمارے خاندان میں اس وقت بہت سے کمیونسٹ بھی تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں، میرے شوہر اور بھائی صاحب ہم تینوں اپنے آپ کو انسانیت کا خادم سمجھتے رہے جب کہ ترقی پسند ہمیں ترقی پسند سمجھتے رہے۔ لیکن ہمارا مقصد صرف ادب کے ذریعے انسانیت کی خدمت رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں کبھی پروپیگنڈا .... اور پبلسٹی نہیں ملی جو ایسے لوگوں کو ملتی ہے۔ ہم نے ہمیشہ یہی چاہا کہ لوگ ہمیں ہماری کتابوں کی وجہ سے جان جائیں۔ اشتہار بازی اور سستی شہرت کو ہمارے یہاں کوئی پسند نہیں کرتا۔ یہی حال میرا ہے۔ میری کوئی پارٹی کوئی قافلہ نہیں رہا۔ لیکن میں جس جگہ گئی مجھے اتنی محبت اتنی عزت ملی جو مجھے بہت متاثر کرتی ہے۔ جہاں جاتی ہوں عورتیں میری پرانی چیزوں کا ذکر کرتی ہیں تو حقیقت یہ ہے کہ مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔"

"آپ نے زیادہ تر عورتوں کے مسائل پر ہی لکھا ہے اس کی کوئی خاص وجہ؟"
"میرا لکھنے کا مقصد انسانیت کی خدمت ہے۔ میں چاہتی ہوں خصوصاً عورتوں کی زندگی بہتر ہو۔ ان کے حالات بہتر ہوں اور سب سے بڑی بات یہ کہ عورت ہی عورت کے مسائل پر لکھ سکتی ہے۔"
"لیکن یہاں آپ ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا راشد الخیری کو فراموش کر رہی ہیں۔"
"بعض مردوں کو چھوڑ دیجیے۔ میں اکثریت کی بات کر رہی ہوں۔ پھر راشد الخیری کے یہاں عورت بہت مظلوم ہے۔ وہ سو برس پہلے کے تصور کا زمانہ تھا۔ اسی طرح حالی کے یہاں عورت کا بہت اونچا تصور ملتا ہے۔ آپ "بیوہ کی مناجات" دیکھ لیں۔ اسی طرح میر انیس کے یہاں عورت کا بلند تصور ملتا ہے جب کہ زیادہ تر کے یہاں عورت معشوقہ ہوتی ہے محبوبہ ہوتی ہے یا بدترین مخلوق ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ مرد عورت کے جذبوں کو پہچاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ کر ہی نہیں سکتے۔ عورت جس طرح عورت کے جذبات بیان کر سکتی ہے مرد نہیں کر سکتا۔"
جی تو چاہ رہا تھا کہ اس سادہ اطوار خاتون سے کوئی تیز سوال نہ کیا جائے۔ لیکن جب تک کڑوی بات نہ کر لوں شاید مجھے چین ہی نہیں پڑتا۔ اس لیے اب کے میرے ذہن میں جس سوال کا بلب جلا دہ تھا۔ "آپ کے یہاں عورت جن مصائب کا شکار نظر آتی ہے کیا آپ اپنے تجربے یا مشاہدے کو من وعن بیان کرتی ہیں یا زیادہ رنگ آمیزی کرتی ہیں؟"
جواب میں انھوں نے غور سے میری طرف دیکھا۔ اور گویا ہوئیں۔
"تھوڑی بہت رنگ آمیزی تو فنکار کا کام ہی ہے لیکن میری کوشش یہی رہی کہ عورت کو پیش کروں تاکہ عورتیں ہی نہیں مرد بھی سمجھ سکیں کہ عورت کیا ہے؟ عورت کیا ہو سکتی ہے؟ اندر سے ایک آمد ہے، جذبات ہیں جو نکلتے ہیں تحریریں۔"
کیا آپ یہ محسوس کرتی ہیں کہ آپ کی تحریر پر منشی پریم چند کا اثر ہے؟"
"میں کسی حد تک پریم چند سے متاثر ہوں۔ انھوں نے دیہاتی زندگی کو دکھانا اپنا مقصد حیات بنا لیا تو میں نے عورت کی زندگی کو اپنا مقصد رکھا ہے۔ اس طرح متاثر ہوں اُن سے لیکن اور کوئی اثر نہیں ہے۔ ویسے میں ان کی بہت زیادہ قدرداں ہوں۔ پسند کرتی ہوں اور ٹیگور کو بھی پسند کرتی ہوں۔"
ابھی کچھ ہی عرصہ ہوا ہندستان میں پریم چند کا صد سالہ جشن منایا گیا۔ اس نسبت سے

ادیب برادری میں بہت سے سوالات اٹھائے گئے جن میں ایک متنازعہ سوال یہ بھی تھا کہ پریم چند بنیادی طور پر ہندی قلم کار تھے۔ انھوں نے اپنے ناول پہلے ہندی میں لکھے جو بعد میں اردو میں ترجمہ ہوئے ـــ یہی سوال میں نے صالحہ صاحبہ کے سامنے دہرایا تو انھوں نے نہایت پُراعتماد لہجے میں جواب دیا

میرا خیال ہے پریم چند کے بیشتر ناول اردو میں ہی لکھے ہوئے تھے لیکن وہ اردو اور ہندی دونوں میں ہی لکھتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ان کا ایک ناول "میدانِ عمل" مکتبہ جامعہ سے چھپا تھا۔ اس کا مسوّدہ انھوں نے ڈاکٹر عابد حسین کو بھیجتے ہوئے لکھا تھا کہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب اس کی زبان دیکھ لیں ـــ تو اس خط کے ساتھ مسوّدہ بھی آیا تھا۔ اور یہ بات میرے علم میں ہے کہ مسوّدہ اُردو میں ہی تھا جب کہ ڈاکٹر مسعود حسین خان کہتے ہیں کہ نہیں یہ ترجمہ ہیں لیکن ہمارا تو یہی خیال ہے کہ پریم چند لکھتے ہیں اردو ہی میں تھے اور پھر ہندی میں ترجمے ہوتے تھے۔"

بات ہو رہی تھی عورت اور اس پر لکھنے والوں کی۔ تو بھلا زنانہ رسائل کیوں نہ یاد آتے۔ اسی حوالے سے میں نے ایک سوال کیا جس کے جواب میں کہا گیا۔

"ہمیشہ سے عورت کی دلچسپیاں اور عورت کے مسائل اور فرائض الگ رہے ہیں اور ہیں۔ پھر اگر عورتوں کے رسائل بھی الگ ہوں تو کیا بُرا ہے؟ لیکن ضروری یہ ہے کہ ان میں عورتوں کی دلچسپی کی چیزوں اور عورت کے فرائض کو اہمیت دی جائے۔"

"اور جو کچھ ہماری ادیب برادری کے بزرگوں کا کہنا ہے کہ ادب میں زنانہ مردانہ ڈبے نہیں ہوتے ہیں؟"

"میں یہ کہتی ہوں جب قدرت نے فرائض میں جنس میں عورت مرد کی تفریق رکھی ہے تو ادب میں کیوں نہیں ـــ ہمارے یہاں تو عورتوں کے رسالے کم رہ گئے ہیں جب کہ آپ کے یہاں حالات بہتر ہیں۔ جو اچھی بات ہے کیونکہ عورتوں کے اچھے رسالوں کو مرد بھی پڑھتے ہیں اگر پڑھنے کی فرصت ہو۔"

"آپ آج کی عورت کو کیسا دیکھنا چاہتی ہیں؟"

"میں پردے کی سختی کی بالکل قائل نہیں ہوں۔ آپ کہیں گی چونکہ میں خود برقعہ نہیں اوڑھتی اس لیے کہہ رہی ہوں لیکن میں نے ۴۷ء تک برقعہ اوڑھا ہے اور برقعے میں ہی تمام کام کیا کرتی تھی۔ پردہ ایسا ہو کہ عورت ہر کام کر سکے۔ بس اپنے مذہب اسلام سے بے بہرہ نہ ہو۔ ننگے پن سے دُور رہے۔

میرے خیال میں اسلامی بلکہ انسانی اخلاقی قدروں کی امین عورت ہے۔ کیونکہ ماں، بہن، بیوی میں قدریں ہوں گی تو مردوں میں بہر حال وہ قدریں پیدا کرے گی اور اسے کرنا چاہیے — میں ایک حد تک عورت کی آزادی کی قائل ہوں۔ وہ حد جو مذہب اور اخلاق سے دُوری ہو جائے وہ حد میرے یہاں نہیں ہے۔ عورت اپنی حدود کے ساتھ ہر محکمے میں ملازمت کر سکتی ہے بہت سے محکمے مثلاً میڈیکل، نرسنگ، ٹیچنگ، اور ادب تو ایسا معلوم ہوتا ہے عورت کے لیے ہی بنائے گئے ہیں۔ لیکن مشکلات بھی ان ملازمتوں میں پیش آتی ہیں جہاں دفتروں میں لڑکیاں کلرک یا ٹائپسٹ جاتی ہیں کیونکہ نو دولتیوں کے اخلاق اتنے گرے ہوئے ہوتے ہیں کہ اوّل تو وہ اصولوں کی پابند لڑکیوں کو رکھتے ہی نہیں ہیں اور جو رکھتے ہیں تو مشکلات پیش آتی ہیں — لیکن میرا خیال ہے آج کی عورت اگر چاہے تو وہ حالات کا مقابلہ کر سکتی ہے اور اسے کرنا بھی چاہیے۔"

قارئین کرام! میرا خیال ہے کافی باتیں بیرونی امور پر ہو چکیں۔ اب ذرا خانگی معاملات پر گفتگو ہو جائے۔

یہ ٹھیک ہے کہ دوسروں کے خانگی معاملات پر کان دھرنا اچھی بات نہیں لیکن جب معاملہ ایسا درپیش ہو کہ کسی شخصیت کی مثال پیش کرنا ہو تو پھر تصویر کے دونوں رُخ اگر سامنے آجائیں تو پھر فیصلے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

جب بات ہو گھر کی چار دیواری کی تو گھر کا تصوّر دو افراد کے بغیر مکمل نہیں ہوتا جو ایک مکان کو گھر کا رُوپ دیتے ہیں۔ اس دو ستونوں والی عمارت کا دوسرا ستون مرد ہے — اور "اس" گھر کا ستون ڈاکٹر عابد حسین تھے۔ جو صالحہ صاحبہ سے سترہ برس بڑے تھے۔ ڈاکٹر عابد حسین نے جرمنی سے فلاسفی میں پی ایچ ڈی — "اے — اے" گریڈ میں کیا تھا جو بہت کم لوگوں کو ملتا ہے۔ انھوں نے جامعہ ملیہ کی تیس برس تک خدمت کی۔ اس کے علاوہ "اسلام اور عصر جدید" نکالا۔ "اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی" قائم کی۔ ۴۷ء کے بعد "نئی روشنی" نکالا جو مسلمانوں کو سہارا دینے کے خیال سے نکالا گیا تھا۔ اس پرچے میں صالحہ صاحبہ نے بھی معاون اڈیٹر کے طور پر کام کیا تھا۔ تراجم بھی کیے۔

"صالحہ صاحبہ! معذرت کے ساتھ ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں وہ یہ کہ آپ نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ پھر ڈاکٹر صاحب جیسے شخص سے شادی کے بعد آپ کو احساس کمتری کا احساس تو نہیں ہوا تھا؟"

جواب میں وہ مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئیں۔

" ہونا تو چاہیے تھا لیکن نہیں ہوا۔ یہ ان کی خوبی ہی تھی کہ انھوں نے مجھے کسی طرح کبھی گھٹیا کمتر نہ سمجھا۔ اور میں نے بھی یونی ورسٹی کی تعلیم نہ ہونے کے باوجود ان کے معیار تک پہنچنے کی کوشش کی۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم دونوں میں جتنی گہری محبت اور دوستی تھی کہ شاید ہندستان پاکستان کے ہزاروں جوڑوں میں سے چند ایک میں ہی پائی جاتی ہو گی ــــ شروع میں تو محسوس ہوتا تھا لیکن چند سال بعد ایج کا فرق بھی مٹ گیا تھا اور ہم دونوں میں دوستی قائم ہو چکی تھی۔ شادی کے نو ماہ بعد بہت بیمار ہو گئی تھی۔ چار پانچ سال بیمار رہی لیکن ڈاکٹر صاحب نے ایسی خدمت کی جو عورتیں بھی کم کر سکتی ہیں۔"

" آپ دونوں میں کبھی لڑائی بھی ہوتی تھی ؟"

" لڑائی ہوتی تھی لیکن خاندانی معاملات پر نہیں بلکہ حالیؔ، اقبالؔ ــــ غالبؔ پر ہوتی تھی۔ ادبی بحثیں ہوتیں۔ مختلف رائٹرز کے اسٹائل پر بحثیں ہوتیں ــــ اختلاف رائے ضرور ہوتا تھا نہایت بے تکلفی سے لیکن پھر من جاتے تھے۔ کبھی احساسِ کمتری نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ میں زیادہ کھاتے پیتے گھرانے کی تھی لیکن ہم احساسِ کمتری کے مرض سے محفوظ رہے اور زندگی کے پینتالیس سال بے مثل گزرے۔ اب دو سال ان کے انتقال کو ہو گئے ہیں چلتی پھرتی نظر آتی ہوں لیکن اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد مجھے ہارٹ اٹیک ہوا تو ڈاکٹروں نے کہا جو چاہوں ان پر لکھوں ورنہ پاگل ہو جاؤں گی۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے لگتا تھا کہ اب کبھی قلم ہاتھ میں نہ لے سکوں لیکن اجب ان پر کام شروع کیا تو بات بنی۔ اب ان دو سالوں میں ان کے لیے ہی زیادہ تر کام کیا ہے۔"

میرے ایک سوال کے جواب میں صالحہ صاحبہ نے کہا۔

" میں اُن کی دوسری بیوی تھی۔ ان کی شادی بہت کم عمری میں اپنے سے بڑی خاتون سے ہو گئی تھی۔ اس لیے میرے سسر کی تمنا تھی کہ بچّہ ہو ــــ لیکن جب میری بچّی کا انتقال ہوا اور میں بیمار پڑ گئی تو انھوں نے پھر ذکر ہی نہیں کیا۔ بلکہ یہی کہتے تھے میں تو اہمیت نہیں دیتا۔ دوستی سے بڑھ کر میرے لیے کوئی چیز نہیں ہے۔"

اب ایک بار پھر میں نے گفتگو کا رُخ ادب کی طرف موڑا اور اب مجھے کھوج ہوئی کہ حالیؔ کی پر نواسی نے شعر کیوں نہ کہے جس کے جواب میں کہا گیا۔

"مجھے شاعری سے دلچسپی اس حد تک ہے کہ اعلا درجے کے شاعروں کو پڑھا ہے۔ جدید شاعری سے ذوق نہیں ہے۔ کلاسیکل شاعری زیادہ پسند ہے۔ میں خود شعر نہیں کہتی ہوں۔ لیکن میرے کان کہتے ہیں کون سا شعر اچھا ہے۔ پہلے تو بہت سے شعر یاد رہتے تھے لیکن اب یاد نہیں رہتے۔"

"اس وقت جو بھی شعر یاد آرہا ہو سنا دیجیے۔"

"اس طرح تو یاد نہیں آسکتا۔" پھر کچھ دیر بعد کہتی ہیں۔"حالی کی غزلوں کی طرف لوگوں کی توجہ زیادہ نہیں ہے۔ لیکن انھوں نے غزلیں بھی اعلا پایے کی کہی ہیں۔ مثلاً ایک اچھا شعر اُن کا یاد آرہا ہے ؎

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گُلِ تر کی صورت

اس کے علاوہ ایک اور غزل کا شعر ہے ؎

قلق اور دل کا سوا ہو گیا
دلاسا تمھارا بلا ہو گیا

شعر کی تاثیر کے بارے میں میرے ایک سوال کے جواب میں صالحہ صاحبہ نے کہا۔

شعر کا تو سبھی پر اثر ہوتا ہے خصوصاً جب سخت وقت پڑتا ہے۔ میر انیس کا کلام بہت زیادہ متاثر کرنے والا ہوتا ہے۔ انیس پر میں نے کام بھی بہت کیا ہے۔ لیکن غالب کی صفت یہ ہے کہ وہ ہر موقع پر کہیں نہ کہیں آپ کو شعر میں مل جائے گا۔ میں نے ایک مزاحیہ مضمون لکھا تھا۔ "بیگم غالب کے اشعار" اس میں مَیں نے غالب کے اشعار کا تصرف کیا تھا۔ مثلاً اس وقت اس مضمون کا ایک شعر یاد آرہا ہے ؎

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو تو نے میرے پاؤں ذرا داب تو دے"

صالحہ صاحبہ نے اپنی بات ختم کی تو اگلا سوال تیار تھا۔

"کچھ لوگ کہتے ہیں آج کے سائنسی دور میں ادب کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ آپ کیا کہتی ہیں؟"

"اہمیت کیا ہے یہ تو دنیا جانتی ہے۔ سائنس بھی ایک علم ہے۔ لیکن آرٹ کی اہمیت اپنی جگہ، سائنس کی اہمیت اپنی جگہ رہی ہے۔ اس دنیا میں شاعر بھی، ادیب بھی، آرٹسٹ بھی اور مصور

بھی ہمیشہ رہے ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ آرٹ کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن مستقل قدر ہے آرٹ، ادب، شعر کی۔ اور ہمیشہ رہے گی۔ اس میں سائنسی اثرات ضرور آئیں گے۔ چاند سا چہرہ نہ کہا جائے گا لیکن ادب اپنی جگہ پر رہے گا۔"

اب گفتگو معاشرے سے معاشرتی سدھار کی طرف آئی۔ اس ضمن میں میرے ایک سوال کے جواب میں صالحہ صاحبہ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"جتنا اچھا ادیب ہوگا، جتنا اچھا شاعر ہوگا اتنا ہی اثر ڈالے گا۔ فنکار تو بڑا حساس ہوتا ہے۔ قوم کے ملک کے زخم . . . کمزوریاں اور خرابیاں محسوس کرسکتا ہے۔ بیان بھی کرسکتا ہے اور ظاہر ہے جتنا زیادہ زور بیان ہوگا اتنا اچھا اثر ہوگا۔ اس کی ایک مثال یہ لے لیجیے جس زمانے میں ہندستان پاکستان کے تعلقات کشیدہ تھے۔ سردار جعفری نے اس زمانے میں "پیار کی سرحد کوئی نہیں" لکھا۔ جس کا جواب نہیں ہے۔ جرنلزم پر تو لکھا جاتا ہی رہتا ہے لیکن شاعر ادیب جو وقتی چیزوں پر نہیں لکھتا ہے۔ وہ ٹھوس مسائل پر قلم اٹھاتا ہے۔ اس طرح وہ محبت اتفاق اور انسانیت کے جذبات بیدار کرنے میں بہت موثر کردار انجام دے سکتا ہے — لیکن ضروری یہ ہے کہ وہ ان کو ادب میں اس طرح ڈھالے کہ پروپیگنڈا محسوس نہ ہو۔"

کئی بار ایسا ہوا کہ کسی ادیبہ، شاعرہ سے ملاقات ہوئی میں نے ان سے پسندیدہ کتاب کے بارے میں پوچھا۔ یہ بات چیت ظاہر ہے پاکیزہ میں چھپی۔ پھر ایک روز افسانہ نگار اور ناول نگار صاحبہ نے بڑے پیار سے مجھ سے کہا۔ "تم ایسے سوال کیوں کرتی ہو ماں کو تو سارے بچے پیارے ہوتے ہیں۔" اور اس وقت جب میں ایسی ہستی کے قریب بیٹھی ہوں۔ جس کے ریکارڈ میں چالیس کتابیں ہیں۔ ایک بار پھر یہ سوال ذہن میں اُبھر اُبھر کر آتا رہا اور میں خود کو اس سوال سے باز نہ رکھ سکی کہ آپ کو اپنی کون سی کتاب سب سے زیادہ عزیز ہے؟ جس کے جواب میں صالحہ عابد حسین صاحبہ نے کہا۔

"سب ہی کتابیں عزیز ہیں — پسند نہ ہوتی تو چھپواتی کیوں؟ ہاں یہ ضرور ہے — کہ دو ناول میں نے خونِ جگر سے لکھے ہیں — ایک ہے "اپنی اپنی صلیب" اور دوسرا "یادوں کے چراغ" جب کہ ایک ناول "گوری سوئے سیج پر" سب سے کم وقت میں لکھا تھا۔ یہ میں نے دو تین ماہ میں لکھ ڈالا تھا۔ اس زمانے میں، میں اسپتال میں داخل تھی اور میرا میجر آپریشن ہونے والا تھا۔ میں اسپتال میں لکھا کرتی تھی تو ڈاکٹر نرسیں سب کہا کرتے آپ اسے ہندی میں چھپوائیں یا انگریزی میں تاکہ ہم بھی

اسے پڑھ سکیں"۔

جانے ابھی سوالات کا یہ سلسلہ کہاں تک دراز رہتا کہ صالحہ عابد حسین صاحبہ کی میزبان کمرے میں داخل ہوئیں۔ سلام دعا کے تبادلے کے بعد انھوں نے اس انداز سے انٹرویو کی طوالت کا ذکر کیا کہ مجھے یوں لگا جیسے گلاب کی طرف بڑھتی ہوئی انگلیاں کانٹے سے زخمی ہوگئیں۔ تب میں نے اختتامی سوال کر کے رخصت چاہی۔ اس سوال کے جواب میں صالحہ صاحبہ نے کہا۔

"کوئی ایسا ایکٹ قائم ہونا چاہیے جس کے ذریعے ہندستان اور پاکستان کے ادیبوں کو رائلٹی کے سلسلے میں تحفظ حاصل ہوسکے۔ دونوں ممالک میں کتابوں کا تبادلہ بھی ضروری ہے تاکہ دونوں طرف کے ادیب اور شاعر ایک دوسرے کے کام سے واقف رہیں۔ اس کے لیے تحریک پاکستان کی طرف سے ہونی چاہیے کیونکہ ہماری حکومت کو اردو سے اتنا تعلق تو ہے نہیں اس لیے یہ ذمہ داری پاکستان پر عائد ہوتی ہے"۔

مسرور جہاں

صالحہ عابد حسین

کھلتا ہوا گندمی رنگ، بھرا بھرا گول چہرہ، چشمے کے عقب سے جھانکتی ہوئی آنکھوں میں ذہانت کی چمک، لبوں کی مسکراہٹ میں شفقت اور محبت کا رچاؤ — حلم اور بردباری کا پیکر، سراپا انکسار و مروت، رکھ۔ رکھاؤ میں پرانی تہذیب و اطوار کی جھلک، مشرقی روایات کی جیتی جاگتی تصویر —

یہ تھیں بیگم صالحہ عابد حسین — ملک کی نامور ادیبہ جو میری آپا تھیں۔ ان کی ذات میں مجھے ایک مشفق بڑی بہن مل گئی تھیں میرے لیے ان کی دائمی مفارقت ایک سانحۂ عظیم ہے۔ وہ میرے لیے ایک بزرگ دوست بھی تھیں۔ اور بہن بھی ایک رشتہ کا صدمہ کم نہیں ہوتا میرے تو ان سے کئی رشتے تھے۔ کس کس کا غم کروں — کس کس کا صدمہ کروں —؟

میرا ان سے پہلا رشتہ ایک ادیب اور قاری کا تھا اپنی طالب علمی کے زمانہ سے ہی میں ان کی ناولوں کی پرستار تھی۔ ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری اور منشی پریم چند کے بعد وہی ایک ایسی ادیبہ تھیں جن کے ناول بہو بیٹیاں کھلے عام پڑھتی تھیں اور بڑے اپنے چھوٹوں کو ان کی ناولیں پڑھنے کی ترغیب دیتے تھے۔ پھر جب میں اپنی محبوب ادیبہ سے ملی تو پرستاری کے رنگ مزید گہرے ہو گئے ان کی شفقت اور محبت نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا وہ میری تحریروں کی تعریف کرتیں تو مجھے ان کے بڑے پن کا احساس ہوتا۔ ان کی محبتوں اور شفقتوں کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ مجھے خطوط لکھتیں کبھی لکھنؤ تشریف لاتیں تو آنے سے قبل مجھے خط لکھ کر اطلاع دیتیں کبھی کسی وجہ سے میں ان سے ملنے نہ جا پاتی تو وہ زحمتیں اٹھا کر خود میرے پاس

تشریف لائیں۔ اللہ رے وضع داری اور مروّت۔ میں نے چند ہستیوں کے علاوہ بہت کم لوگ ایسے دیکھے ہیں جو اخلاق اور مروت میں صالحہ آپا کی طرح ہوں۔ ان کی شفقت اور محبت میرا ایک قیمتی سرمایہ تھی۔ ان کے انتقال سے اردو زبان کا ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ اور ادبی دنیا۔ اردو کی ایک بے لوث خادمہ سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی ہے۔ یہ اردو زبان و ادب کی بد قسمتی ہے کہ ایک قلیل عرصہ میں دو نامور ادیب، خواجہ احمد عبّاس اور بیگم صالحہ عابد حسین ہم سے جدا ہو گئے۔ اور یہ دونوں ایک ہی تہذیبی وراثت کی آخری کڑی تھے۔ خواجہ الطاف حسین حالی، خواجہ غلام الثقلین اور خواجہ غلام السیدین کے بعد خواجہ احمد عباس اور بیگم صالحہ عابد حسین ہی اس ادبی وراثت کے امین تھے۔ ان کے ساتھ ایک طویل تہذیبی وراثت کا خاتمہ ہو گیا۔ جس پر انھیں بے حد ناز تھا۔ اور جسے انھوں نے بڑی آن بان سے سنبھالا تھا۔

یہ سچ ہے کہ انھیں ادبی ذوق ورثے میں ملا تھا لیکن ان میں جوہر بھی بدرجۂ اتم موجود تھا۔ جسے ان کے لائق اور فائق شوہر ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے پہچانا۔ اور ان کے ذوق کو نکھارنے سنوارنے میں بھرپور تعاون دیا۔

ڈاکٹر عابد حسین صاحب ملک کے عظیم دانشور اور ادیب تھے۔ ان کی رفاقت اور رہنمائی نے بیگم صالحہ عابد حسین کے ادبی ذوق کو مزید نکھارا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کو اپنا استاد کہتی تھیں۔ اپنی خود نوشت میں انھوں نے بڑی محبت سے اس کا اعتراف کیا ہے انھیں اپنے عالی مرتبت شوہر سے بے پناہ عقیدت اور محبت تھی جو بیک وقت ان کے شوہر۔ دوست، محبوب اور استاد تھے۔ وہ اپنے شریک زندگی کے ساتھ ہمیشہ قدم سے قدم ملا کر چلیں۔ ڈاکٹر عابد حسین نے خود کو جامعہ ملیّہ اسلامیہ کی ترقی اور بقا کے لیے وقف کر دیا تھا بیگم صالحہ عابد حسین نے بھی اپنے عظیم شوہر کے مقصد کی تکمیل میں ہاتھ بٹایا۔ قربانیاں دیں۔ دکھ اٹھائے اور صحیح معنوں میں خود کو اپنے شریکِ حیات کے مقاصد کے لیے وقف کر دیا۔ اور بڑے خلوص سے ان کا ساتھ دیا۔

بیگم صالحہ عابد حسین کو تین عظیم شاعروں سے بے حد عقیدت تھی۔ حالی، غالب اور میرانیس۔ حالی ان کے بزرگ تھے۔ جن کے کلام سے وہ بے حد متاثر تھیں۔ حالی پر انھوں نے کئی مضامین اور ایک مکمل کتاب یادگار حالی لکھی ہے۔ غالب پر بھی کئی مضامین لکھے۔ میرانیس سے ان کی عقیدت اہلبیتِ رسول کے توسط سے تھی۔ جن کے مرثیے وہ بچپن سے سنتی

اور پڑھتی آئی تھیں۔ میر انیس کے کلام سے وہ بے حد متاثر تھیں۔ خصوصاً ان کے مرثیوں میں کردار نگاری اور جذبات انسانی کی عکاسی نے صالحہ عابد حسین پر گہرا اثر چھوڑا۔ انھوں نے میر انیس کے مراثی کا انتخاب پیش کرنے کے علاوہ ایک مبسوط کتاب، خواتین کربلا، کلام انیس کے آئینے میں تخلیق کر کے اپنے محبوب شاعر کو خراج عقیدت پیش کیا ہے جس نے اپنی کردار نگاری سے مخدرات عصمت کے کردار کو واقعہ کربلا کے پس منظر میں پیش کر کے اہلبیت رسولؐ سے اپنی عقیدت کا حق ادا کر دیا ہے۔

بیگم صالحہ عابد حسین کی تصانیف میں سفر نامہ، خود نوشت، تنقیدی مضامین، افسانے، بچوں کے لیے کہانیاں وغیرہ کی اصناف شامل ہیں لیکن ان کی پہچان ناول نگار کی حیثیت سے ہے۔ بلا شبہ وہ صف اول کی ناول نگار تھیں ان کے ناولوں کا ایک خاص مقام ہے۔ ان کے ابتدائی ناولوں میں گاندھیائی فلسفے کی چھاپ نظر آتی ہے۔ جس دور میں انھوں نے قلم اٹھایا وہ ہندستان کی جدوجہد آزادی کا زمانہ تھا ایک حساس ادیبہ کا اپنے ملک کی تحریک آزادی سے متاثر ہونا ناگریز تھا۔

صالحہ عابد حسین صاحبہ منشی پریم چند کی تحریروں سے متاثر تھیں۔ لیکن ان کے تصنیف کردہ ناولوں میں منشی پریم چند کا رنگ کہیں نہیں نظر آتا۔ بس ایک بات دونوں ادیبوں میں مشترک تھی۔ دونوں حقیقت پسند تھے۔ بیگم صالحہ عابد حسین نے اپنی ناولوں میں متوسط طبقے کے مسلمانوں کی زندگی اور مسائل پیش کیے ہیں۔ ان کا اپنا اسلوب ہے اپنا علاحدہ مزاج ہے عذرا، آتش خاموش راہ عمل، قطرے سے گہر ہونے تک، ان کے ابتدائی دور کے بے حد کامیاب ناول ہیں۔ ادھر چند برسوں میں ان کے جو ناول منظر عام پر آئے ہیں ان میں اپنی اپنی صلیب، گوری سوئے سیج پر، الجھی ڈور۔ اور ساتواں آنگن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ملک کی آزادی کے بعد ہمارا معاشرہ جن مسائل سے دوچار ہوا ہے۔ صالحہ عابد حسین نے اپنی ناولوں میں ان کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ ان کے ناولوں کا خاص موضوع انسان دوستی، قومی یکجہتی مسلم معاشرہ کی اصلاح اور ہندستانی سماج میں عورت کی حیثیت، نوجوانوں کی بے راہ روی۔ جہالت اور غریبی ہے۔

وہ انسانی رشتوں کی عظمت کو اولیت دیتی ہیں ان کی تحریروں میں جا بجا اس کا اظہار ملتا ہے۔

سلسلہ، روز و شب ان کی مختصر سوانح حیات ہے جس میں وہ خود نمائی اور خود ستائی سے کوسوں دور نظر آتی ہیں۔ بڑی سادگی سے انھوں نے اپنی زندگی کے واقعات کو قلم بند کیا ہے۔

"سفر زندگی کے لیے سوز و ساز" بیگم صالحہ عابد حسین کا سفر نامہ ہے۔ اسے پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کوئی معصوم بچہ حیرت اور مسرت سے دنیا کے تمام خوش کن مناظر کو اپنی شفاف آنکھوں کے ذریعہ اپنے بے ریا دل میں اتار رہا ہو۔ یہاں ان کا انسان دوستی کا جذبہ کچھ اور زیادہ وسیع نظر آتا ہے۔ وہ جس ملک گئیں۔ وہاں کے لوگ، سبزہ، پھل، پھول برف، پرندے سب کچھ اپنے اپنے سے محسوس کیے۔ ان کے حساس قلم نے اپنے پن کے جذبوں کو لفظوں کا پیراہن عطا کیا اور تمام عالم کو انسانی برادری کی ایک ڈور میں باندھ کر انسان دوستی کا پیغام دیا۔

"جانے والوں کی یاد آتی ہے" ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے ایسے دوستوں اور رفیقوں کا ذکر کیا ہے جن سے ان کے گہرے روابط اور ذاتی تعلق تھا۔ یہاں ان کا قلم بے حد جذباتی ہو گیا ہے۔ اپنے پیاروں کی مفارقت کا غم برداشت کرنا کچھ ایسا سہل بھی تو نہیں ہے۔

عابد ولا کے پُرسکون گوشے میں بیٹھ کر وہ ساری زندگی تخلیقی کاموں میں مصروف رہیں۔

حکومت ہند نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں پدم شری کا اعزاز دیا۔ پچھلے دنوں انھیں غالب ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اور بھی نہ جانے کتنے ایوارڈ۔ اور اعزازات انھیں پیش کیے گئے۔ لیکن ان کی سادگی اور انکساری میں کبھی فرق نہ آیا۔ دہلی کی کئی ادبی تنظیموں کی وہ سرپرست رہیں۔ سرکاری اداروں کی ممبر رہیں۔ لیکن کبھی کسی گروپ سے وابستہ نہیں ہوئیں۔ وہ ایک مخلص اور دیانتدار ادیبہ تھیں۔ اور آخر دم تک اردو زبان و ادب کی خاموشی سے خدمت کرتی رہیں۔ نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا کے اصول پر تمام عمر کاربند رہیں۔ شاید یہ اردو زبان سے ان کی بے پناہ محبت کا اعجاز تھا۔ کہ مسلسل خرابی صحت کے باوجود ان کا قلم نہ کبھی بیمار ہوا۔ اور نہ تھکا۔

بیگم صالحہ عابد حسین اولاد کی نعمت سے محروم تھیں جس کی تلافی انھوں نے اس طرح کی کہ اپنی ممتا، محبت اور شفقت کا خزانہ، عزیزوں اور خاندان کے بچوں پر بے دریغ لٹا یا۔

ڈاکٹر عابد حسین صاحب کے بعد وہ خاندان کی اہم ہستی تھیں جن کے صلاح و مشورے کے بغیر اہل خاندان کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ اور وہ بھی خلوص دل سے اپنے عزیزوں اور ان کے بچوں کے مسائل تعلیم و تربیت شادی بیاہ وغیرہ میں پوری دلچسپی لیتی تھیں۔

صالحہ عابد حسین کی صحت یوں تو اکثر خراب رہتی تھی لیکن اپنے عظیم المرتبت شوہر کی رفاقت اور محبت نے انھیں زندہ رہنے کا حوصلہ بخشا تھا وہ بیماریوں کو شکست دیتی رہیں۔ شوہر کی دائمی مفارقت نے ان سے جینے کا حوصلہ چھین لیا۔ بیک وقت کئی امراض ان پر غالب آ گئے سانسوں کی ڈور کمزور ہوتی گئی۔ اس بار نہ ڈاکٹروں کی تگ و دو کام آئی نہ پرستاروں اور مداحوں کی دعاؤں نے اثر کیا۔ نہ چاہنے والے عزیزوں کی خدمت اور دعائیں کام آئیں۔ ان کے ساتھ ایک تہذیب ایک روایت کا خاتمہ ہو گیا۔ ان کے جانے سے ایک ساتھ کئی چراغ گل ہو گئے۔ عابد ولا۔ جو صالحہ عابد حسین کا کعبہ تھا۔ آج ان کے بغیر سونا ہو گیا۔

اس عابد ولا میں انھوں نے دکھ سکھ کا ایک طویل عرصہ گزرا تھا۔ یہیں وہ مصداق فاطمہ سے صالحہ بنیں تھیں۔ یہیں انھوں نے علم و ادب کی شمع روشن کی تھیں۔ اور آج اسی جامعہ ملیہ کی زمین میں وہ ابدی نیند سو رہی ہیں۔ ان کو رونے والوں میں عزیزوں اور دوستوں کے علاوہ ایک بڑی تعداد ان کے پرستاروں اور مداحوں کی بھی ہے۔ وہ جو اخلاق محبت، مروت اور انسانیت کا سرچشمہ تھیں۔ اب اپنی تحریروں میں زندہ رہیں گی۔

جہاں جہاں اردو زبان و ادب کے جاننے والے ہیں۔ صالحہ عابد حسین کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

ڈاکٹر جاوید احمد

یادگار حالی ـــــ صالحہ عابد حسین

تقریباً نو سو برس قبل انصاریوں کا ایک خاندان تہران سے پانی پت آ کر بس گیا تھا۔ اس خاندان میں بڑے بڑے صاحبان علم و کمال پیدا ہوئے جن میں محض حالی، خواجہ احمد عباس اور خواجہ غلام السیّدین کے نام لینا کافی ہے۔ مصداق فاطمہ نے اسی ذی علم گھرانے میں آنکھ کھولی۔ انھوں نے صالحہ کے قلمی نام سے لکھنا شروع کیا اور شادی کے بعد شوہر کے نام کی مناسبت سے صالحہ عابد حسین کے نام سے ادبی حلقوں میں مقبول ہوئیں۔ ان کا خاندان نہ صرف اپنی علم دوستی کے لیے مشہور رہا ہے بلکہ سماجی اصلاح، مذہبی خدمت اور اعلا اخلاق کی پاسداری میں بھی ممتاز ہے۔ حصول علم اور ملازمت کے سلسلے میں خاندان کے بیشتر افراد ملک کے مختلف حصّوں میں پھیل گئے اور ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ کے بعد صالحہ عابد حسین کے بھائی بہنوں اور چند افراد کو چھوڑ کر باقی سبھی نہ صرف پانی پت بلکہ ہندستان سے بھی ہجرت کر گئے۔

آپ کے والد خواجہ غلام الثقلین اپنے زمانے کے مستند عالم، ادیب، مصلح اور بے حد قابل و ذہین آدمی تھے اس زمانہ کے مشہور رسالہ "عصر جدید" کے اڈیٹر بھی تھے ان کے والد کے کتب خانہ میں آرٹ، سائنس، فلسفہ، مذہب اور ہر مضمون کی بہت سی کتابیں موجود تھیں۔ انھوں نے صرف بیالیس برس کی عمر پائی اور بطور یادگار کئی بلند پایہ تصانیف اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ والدہ مشتاق فاطمہ اردو کے مایۂ ناز ادیب و نقّاد خواجہ الطاف حسین حاؔلی کی بڑی پوتی تھیں، اور دادا سے تعلیم و تربیت کی دولت پائی تھی لہٰذا ان کی بہت سی

صفات کی مالک تھیں نیز سیرت کی یہی خوبیاں ان کی اولاد میں بھی منتقل ہوئیں۔ جب والد کا انتقال ہوا اس وقت مصداق فاطمہ کی عمر چودہ سال کی تھی۔ والدہ اور چچا خواجہ غلام الحسنین نے پرورش اور تربیت کا بوجھ اٹھایا۔ والدہ کی ایک چھوٹی سی لائبریری گھر میں موجود تھی۔ جس میں عورتوں کے مذاق کی کتابیں موجود تھیں۔ خاندان میں مردوں کو ہی نہیں عورتوں کو بھی پڑھنے لکھنے سے دلچسپی تھی۔ مذہبی تعلیم اور مذہب سے بھی شغف تھا۔ اس لگاؤ کے پیچھے ان کے بڑے چچا خواجہ غلام الحسنین کا بڑا ہاتھ تھا۔ مرحوم کا مذہبی مطالعہ بڑا گہرا تھا۔ مذہبی قدروں میں گہرا یقین رکھتے تھے۔ ان کی ساری عمر تصنیف و تالیف میں گزری۔ مذہب، اخلاق، فلسفہ اور بچوں کی دلچسپی کی کتابیں لکھیں۔ ہربرٹ اسپنسر کے "فلسفہ تعلیم" کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ان کی دو بڑی بہنیں سیدہ خاتون اور مرحومہ فاطمہ زیدی کو بھی لکھنے پڑھنے کا شوق تھا حالانکہ پانی پت کے شرفا میں لڑکیوں کے لکھنے پڑھنے پر سخت پابندی تھی۔ مگر حالیؔ خاندان میں لڑکیوں کو پڑھنا لکھنا سکھایا جاتا تھا۔ صالحہ عابد حسین کے بھائی بہنوں نے اپنے اپنے طور پر کافی کام کیا خود انھیں اسکول کے زمانے سے مضمون لکھنے اور تقریریں کرنے کا شوق تھا جو والد سے ورثہ میں ملا تھا مختصر یہ کہ صالحہ عابد حسین نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ ایسے ماحول میں پلنے بڑھنے والی بچی پر اس کا اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ نو، دس برس کی عمر سے ہی لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا اور عمر کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا رہا۔

چونکہ صالحہ عابد حسین کے بچپن میں پانی پت میں لڑکیوں کے لیے ایسا کوئی اسکول نہ تھا جہاں شرفا اپنی بچیوں کو بھیج سکیں البتہ بعد میں خواجہ سجادؔ حسین نے حالی مسلم گرلز اسکول قائم کیا جس میں ان کی بہت سی رشتہ کی بہنوں نے تعلیم حاصل کی۔ صالحہ عابد حسین کی پرائمری کی تعلیم علی گڑھ سے شروع ہوئی مگر والدہ کے انتقال کے بعد پانی پت لوٹنا پڑا پھر دو تین سال کے وقفہ کے بعد حالیؔ مسلم گرلز اسکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۰ء میں شادی کے بعد پنجاب سے آنرز ان اردو (ادیب فاضل) کیا۔ اس امتحان کے لیے جو مقالہ لکھا اس نے انہیں سے دلچسپی پیدا کر دی جس نے بعد میں گہرے لگاؤ کی صورت اختیار کر لی۔ پنجاب سے صرف انگریزی کا پرچہ دے کر میٹرک کی سند حاصل کر لی گو کہ رسمی تعلیم اتنی ہی ہے مگر علم کی سچی تڑپ نے

بے تحاشہ مطالعہ پر مجبور کیا اور اس لگن کے نتیجے میں علم و ادب، نثر و شاعری، تنقید و تاریخ کی ہزاروں کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اس مطالعہ نے شعر و ادب کو پرکھنے کا سلیقہ پیدا کیا اور ادب کا ستھرا ذوق پیدا کیا۔

شروع میں انگریزی زبان و ادب سے واقفیت واجبی سی تھی مگر خواجہ غلام السیدین کی ہدایت و رہنمائی میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ شادی کے بعد عابد صاحب نے بھی اس کام میں مدد کی۔ سیدین علی گڑھ سے اچھی اچھی کتابیں بہن کے لیے بھجوایا کرتے تھے بہن کے ذوق کی تربیت کرتے تھے۔ دھیرے دھیرے انگریزی کی استعداد بڑھتی چلی گئی۔ انگریزی کے علاوہ دوسری زبانوں کے شہ پاروں سے متعارف ہوئیں چاہے وہ انگریزی کے برنارڈ شا ہوں، بنگالی کے ٹیگور، سرت چندر، روسی کے ٹالسٹائی یا چیخوف یا پھر فرانسیسی ناول نگار ہوں، ان سبھوں کو پڑھ ڈالا۔

ایک علمی گھرانے کی فرد ہونے کے ناتے تصنیف و تالیف کا فطری شوق موجود تھا۔ ذاتی مطالعہ اور غور و فکر نے خیالات میں پختگی، وسعت اور گہرائی و گیرائی پیدا کر دی۔ پہلا افسانہ ۱۹۲۸ء میں "نور جہاں" میں شائع ہوا تھا۔ اس سے پہلے "تہذیب نسواں" اور "پھول" میں ان کے مضامین چھپا کرتے تھے۔ اب قلمی کاوشیں مختلف رسائل و جرائد کے صفحات کی زینت بننے لگیں۔ پہلا ناول سولہ برس کی عمر میں ۱۹۲۹ء میں لکھا تھا جس کا نام "حسن اتفاق" تھا مگر یہ شائع نہ ہو سکا۔ کہانیوں اور ڈراموں کا پہلا مجموعہ "نقش اول" کے نام سے ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا اور پہلا ناول "عذرا" ۱۹۴۶ء میں منظر عام پر آیا جس کے یکے بعد دیگرے کئی اڈیشن شائع ہوئے۔

اسی اثنا میں ۱۹۳۶ء سے ریڈیو کا چلن شروع ہو گیا اور ریڈیو پر بیگم صالحہ کی تقاریر اور ریڈیو فیچروں کا سلسلہ شروع ہو گیا جن کی تعداد سیکڑوں تک جا پہنچی۔ ان میں کہانیاں تھیں، ادبی تقریریں، مزاحیہ خاکے بھی، عورتوں کی دلچسپی کے مضامین، مذہبی نوعیت کے تذکرے اور بچوں کی دلچسپی کے مضامین بھی۔ ان میں سے چنیدہ کو "بات چیت" کے عنوان سے شائع کیا جا چکا ہے۔ مطبوعہ تخلیقات سے قطع نظر بہت سا ذخیرہ ابھی غیر مطبوعہ بھی ہے۔

صالحہ عابد حسین ۱۹۳۳ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مخلص کارکن ڈاکٹر سید عابد حسین

سے بیاہی گئیں۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ دوسری شادی تھی لہذا دونوں کی عمر میں سولہ سترہ برس کا فرق تھا۔ خواجہ غلام السیدین بہن کی طبیعت، خیالات اور مزاج سے واقف تھے اور چاہتے تھے کہ جیون ساتھی ایسا ملے جو دنیاوی اعتبار سے کتنا ہی کم حیثیت کیوں نہ ہو مگر اس میں کردار کی بلندی موجود ہو۔ وہ ذہانت اور اعلا اخلاق کی دولت سے مالا مال ہو۔ یہ سوچ کر ہی انھوں نے اپنے عزیز دوست عابد صاحب کا انتخاب کیا جو کہ برائے نام مشاہرہ پر جامعہ میں استاد تھے۔ خواجہ صاحب کا انتخاب کتنا درست تھا یہ ان دونوں کی خوشگوار ازدواجی زندگی اور ادبی و تخلیقی سرگرمیوں سے ظاہر ہے۔ عمر میں کافی فرق ہونے کے باوجود دونوں میں مکمل ذہنی ہم آہنگی، سچی محبت اور گہری دوستی رہی۔ عابد صاحب صالحہ بیگم کے لیے ہمیشہ ایک آئیڈیل شوہر، ان کے لیے حقیقی دوست، فلاسفر اور گائیڈ ثابت ہوئے۔ عابد صاحب خانگی زندگی میں ہی ان کے ساتھی نہ تھے بلکہ ادبی زندگی میں ایک اچھے دوست، مشیر اور رہنما ثابت ہوئے۔ شادی کے بعد انھوں نے مصداق فاطمہ کی صلاحیتوں کو نکھارنے کی کوشش کی، ان کی تحریروں پر اصلاح دی، ان کے ادبی ذوق کو بلند کرنے کی سعی کی اور اس طرح انھیں اردو دنیا کے لیے صالحہ عابد حسین بنا دیا۔ اپنے بھائی اور شوہر کی وہ ان معنوں میں ممنون رہا کرتی تھیں کہ ان دونوں حضرات کی بدولت اچھی زبان لکھنے کا سلیقہ پیدا ہوا مگر ساتھ ہی یہ بات بھی درست ہے کہ ان دو ادیبوں کا اثر انھوں نے اپنی تحریر میں قبول نہیں کیا اور اپنا ایک منفرد اسٹائل بنائے رکھا۔ اپنے شوہر کے بارے میں ایک جگہ لکھتی ہیں۔

> "مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میری ذہنی نشو و نما میں جن شخصیتوں کا اثر پڑا ہے اس میں میرے شوہر ڈاکٹر عابد حسین بھی ہیں۔ انیس سال کی عمر میں میری ان سے شادی ہوگی۔ میرا ذہن اس وقت کچا، تعلیم ناقص اور تجربہ محدود تھا۔ گذشتہ ۵۰ برسوں میں میں نے، میرے فن نے، میرے خیالات نے ان سے کتنا اثر لیا ہے کہ یہ ایک لمبی داستان ہے جس کو بیان کرنا آسان نہیں۔"

صا۱۱ آج کل دسمبر ۶۹ء

صالحہ عابد حسین میں رشتہ ازدواج میں باندھی گئیں تو کافی کم عمر تھیں مگر جلد ہی اپنی خانگی ذمہ داریوں کو سمجھ لیا اور اپنی بساط بھر انھیں اٹھانے کی کوشش کی۔ خاندان بڑا،

ذمہ داریاں لامحدود اور آمدنی کے ذرائع محدود تھے۔ مالی آسودگی کبھی نصیب نہ ہو سکی مگر رکھ رکھاؤ، مہمان نوازی اور دوسروں کی مدد کرنے اور قرض دینے کے جذبے نے دیکھنے والوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا کہ یہ لوگ آسودہ حال ہیں۔ کسی کی مصیبت دیکھی نہیں جاتی تھی لہٰذا مدد کرنے پر فوراً آمادہ ہو جاتی تھیں اور اکثر دھوکے بھی کھائے۔ خاندان کی ساری ذمہ داریاں خاص طور پر سسرالی، اٹھاتی رہیں چاہے وہ بچوں کی پرورش ہو، تعلیم، نوکری، بیماریاں، شادی بیاہ وغیرہ۔ دونوں میاں بیوی نے ان ذمہ داریوں کو اس طرح بانٹ لیا تھا کہ یہ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ کون سی ذمہ داری کس کی ہے؟ دونوں کے مزاج میں ہم آہنگی تھی جو خوش حال ازدواجی زندگی کی ضامن ہوا کرتی ہے معمولی باتوں پر اختلاف بھی ہوئے مگر دونوں ایک دوسرے کے جذبات کی قدر اور احترام کرتے ہوئے قابل قبول راستہ نکال لیا کرتے تھے۔

بہت کم عمری سے ہی بیماریوں، پریشانیوں اور مصائب کے نرغے میں گھری رہیں مگر یہ رکاوٹیں ان کے مزاج اور عزائم پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ اپنی محرومیوں، ناکامیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے انھوں نے اپنے مقاصد کو اولیت کا درجہ بخشا البتہ اس بات کی ہمیشہ شاکی رہیں کہ ان کے شوہر کو وہ مرتبہ، اعزاز وقعت اور عزت نہیں مل پائی جس کے وہ مستحق تھے۔ بعض لوگوں کو وہ محض اس لیے عزت دیتی تھیں کہ وہ عابد صاحب کی قدر کرتے تھے اور کچھ لوگوں کو محض اس لیے ناپسند کرتی تھیں کہ وہ عابد صاحب سے پرخاش رکھتے یا ان کے بدخواہ تھے۔ عابد صاحب نے اپنا گھربار، بجٹ، آمدنی سب کچھ انھیں سونپ رکھا تھا اور بیگم صاحبہ نے ان ذمہ داریوں کو آخری لمحہ تک نبھایا۔

مشقتِ قلم کے نتیجے میں جو کچھ آمدنی ہوتی تھی وہ گھریلو اخراجات کے لیے وقف کر دی جاتی تھی۔ والدین کی چھوڑی ہوئی جایداد نے آڑے وقتوں میں انھیں سہارا دیا۔ ڈاکٹر صاحب جب تک زندہ رہے سارے خاندان کی کفالت کے ذمہ دار تھے البتہ بیگم عابد حسین کو ملنے والی رقم بجٹ میں کچھ آسانیاں کر دیتی تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد مشکلیں ضرور پیش آئیں مگر آمد و خرچ کا پلڑا عموماً متوازن رہا۔

صالحہ عابد حسین ایک پختہ سیرت اور دلکش شخصیت کی مالک تھیں۔ بچپن سے مزاج میں تیزی تھی مگر نصف صدی کے ریاض نے خود پر کنٹرول کرنے کی عادت سی پیدا کر دی بچپن

سے آخری عمر تک مختلف بیماریوں، صدمات اور حوادث کا شکار رہیں مگر صبر وضبط کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

دو سال کی عمر میں باپ کے سایے سے محروم ہوگئیں نوعمری میں والدہ بھی ساتھ چھوڑ گئیں، چند ماہ بعد جوان بہن اللہ کو پیاری ہوگئی اور شادی کے بعد گلشنِ حیات میں کھلنے والی کلی بھی مرجھا گئی اور بدنصیب ماں آخری دیدار سے بھی محروم رہی۔ اولاد کی محرومی کا یہی درد ان کی تحریروں میں جھلکتا ہے۔ پیار کرنے والے دونوں بھائیوں کے سدھارنے کے بعد شوہر بھی ان سے رخصت ہوگئے اس طرح ان کی زندگی میں ابتدا تا انتہا غموں اور دکھوں کی کڑی دھوپ چھائی رہی ابتدائی عمر سے جن بیماریوں نے دامن پکڑا تو اخیر عمر تک عہد وفا نبھاتی رہیں۔ مرحومہ کا خیال تھا کہ بیماریاں اور حادثے انھیں تلاش ہی کرتے رہتے تھے۔ ان ہی حالات نے انھیں الوری کے اس قطعہ کے آزاد ترجمہ پر مجبور کیا۔

جو بلا آسمان سے آوے ہے یوں تو اوروں کے گھر بھی جاوے ہے
پر وہ آتے ہی سب سے پوچھے ہے صالحہ کس طرف کو رہوے ہے

حالات سے سمجھوتہ کرنے کی ان میں زبردست صلاحیت موجود تھی۔ بڑے بڑے غم آئے مگر طبیعت اور عزم پر وقتی طور پر ہی چھائے رہے وہ دوبارہ اسی لگن اور تندہی کے ساتھ اپنے کاروبار میں لگ گئیں۔ انھوں نے اپنے غموں، دکھوں اور محرومیوں کا مداوا تصنیف وتالیف میں ڈھونڈ لیا تھا۔ ان حالات نے ان کی نجی زندگی اور فن پر اثر چھوڑا مگر وہ ان عارضی رکاوٹوں سے بھلا کب رکنے والی تھیں۔ بیماریاں، صدمات موسم کے شدائد اور غیر ادبی مصروفیات ان کے مقصد میں حائل نہ ہوسکیں۔ انکساری، خودداری، دردمندی، اخلوص، قوتِ برداشت، ایثار، راست گوئی اور انصاف پسندی ان کی سیرت کی بنیادی خصوصیات ہیں کچھ اوصاف ان کی طبیعت کا جزو بن چکے تھے جیسے مذہب کی لگن، علم کوشی، اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس، حق کی تلاش اور ان پر اٹل رہنا، صبرِ جمیل وغیرہ۔ مذہب سے لگاؤ انھیں وراثت میں ملا تھا ان کے اجداد اعلا مذہبی عہدوں پر فائز رہے تھے خاص طور پر ان کے چچا اور والد نے اسلام کی بڑی خدمت کی۔ والد نے "عصرِ جدید" کے نام سے رسالہ جاری کیا تاکہ مسلمانوں میں بیداری، آگہی اور تعلیم کی روح پھونکی جاسکے اسی رسالہ کی ترمیم شدہ شکل "اسلام اور عصرِ جدید" ہے جسے ان کے داماد ڈاکٹر سید عابد حسین نے جاری کیا تھا

غرض کہ مولانا حالیؔ، خواجہ سجاد حسین، خواجہ غلام الحسنین، خواجہ غلام الثقلین اور خواجہ غلام السیّدین کی آغوش تربیت سے نکلنے والی شخصیت پر اُن تمام کے اثرات پڑنا لازمی تھا چنانچہ موصوفہ بھی الٰہی اوصاف سے متّصف ہوئیں۔

بیگم صاحبہ کو بچپن ہی سے مذہب اور مذہبی تعلیم سے دلچسپی رہی۔ خاندان میں غیر رسمی طور پر یہ سمجھوتہ تھا کہ مرد سُنّی اور عورتیں اہل تشیع کے مسلک پر عمل پیرا ہوئیں اور اس معاہدہ میں کبھی کوئی الجھن یا بدمزگی پیدا ہونے نہیں پائی۔ چنانچہ آپ شیعی عقائد کی پیروکار تھیں مگر قرآن شریف اور مذہبی کتاب کے مطالعہ، آنحضرت کی سیرت پاک، آئمہ کرام کی سوانح حیات، مولانا آزاد کے ترجمان القرآن اور سورہ فاتحہ کے مطالعہ نے ان میں رواداری، بے تعصبی اور وسیع القلبی پیدا کر دی۔ وہ رسمی، تقلیدی، پُر تصنّع اور روایتی مذہب کو سخت ناپسند کرتی تھیں اسلام کے علاوہ دوسرے مذہب کا بھی مطالعہ کیا تھا جس نے ان میں کشادہ ذہنی اور فراخ دلی پیدا کر دی تھی۔ انھیں نمائش اور ظاہر پرستی سے چڑھ تھی۔

صالحہ عابد حسین خود کو بڑا خوش قسمت تصور کرتی تھیں کہ انھیں بچپن ہی سے عظیم شخصیتوں کے زیر سایہ پروان چڑھنے کا موقع ملا ان تمام صاحبان کے خیالات نے ان کی تحریر اور فن پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں بے انتہا درد ہونے کے باوجود یاسیت یا قنوطیت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ زندگی کا ایک روشن تصوّر اور نظریہ ملتا ہے۔ قدرت کی عطا کردہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر زندگی گزارنے اور بنی نوع انسان کی خدمت کرنے کا درس ملتا ہے۔ بدترین حالات میں بھی ہمت نہ ہارنے اور اپنے مقصد کو فراموش نہ کرنے کی تعلیم ملتی ہے۔ صبر جمیل اور راضی برضا رہنے کا احساس پیدا ہوتا ہے، عزائم بلند ہوتے ہیں اور ان کی تخلیقات ایک واضح اور بلند منزل کی نشاندہی کر کے قاری کو انھیں بالواسطہ طریقے پر اپنانے کی دعوت دیتی ہیں۔ چند اور شخصیتیں ایسی ہیں جنھیں وہ بے حد عزیز رکھتی تھیں اور ان سب کا تذکرہ انھوں نے اپنی پُر افتخار تصنیف "جانے والوں کی یاد آتی ہے" میں کیا ہے۔ یہ ہیں سیّد حسین اصغر داعی پوری، مولانا اسلم جیراج پوری، مولانا آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین اور گاندھی جی۔

ایک ادبی وعلمی گھرانے سے تعلق رکھنے کی بنا پر بیگم عابد حسین کا تعلق بچپن ہی سے کتابوں سے تھا۔ گھر میں والد اور حالی کی کتابوں کے ذخائر تھے علاوہ ازیں والدہ کی بھی اچھی خاصی لائبریری تھی مگر اس میں کچھ کتابیں "شجر ممنوعہ" کی حیثیت رکھتی تھیں اور اور کچھ ایسی تھیں جو اُن کے ناپختہ ذہن کی رسائی سے دور تھیں مگر ہوش سنبھالتے ہی مطالعہ کا چسکا پڑ گیا۔ بڑے بھائی سیدین علی گڑھ سے اچھی اچھی کتابیں روانہ کیا کرتے تھے اس طرح ڈھیرے ڈھیرے کتابوں سے محبت بڑھتی ہی گئی۔ والدہ افضل علی، شوکت آرا بیگم جیسی خواتین ناول نگاروں کے پاکیزہ اور اصلاحی ناولوں سے لے کر نذیر احمد، پریم چند، شرر اور سرشار سبھی کو پڑھ ڈالا یوں تو ان کے محبوب فن کار کئی ہیں مگر کچھ کو وہ حد درجہ اہمیت دیتی ہیں۔ ڈاکٹر زرینہ ثانی کے سوال نامہ کے جواب میں لکھتی ہیں۔

> "کچھ ایسی ہستیاں ہیں جن سے روحانی تعلق رہا ہے مولانا حالی، انیس اقبال، غالب اور پریم چند وہ ادیب ہیں جن کا میرے ذہن، میرے فن اور میرے دل سبھی نے گہرا اثر قبول کیا ہے۔ کچھ میرے قریب ترین عزیز ہیں جو میری خوش بختی سے علم و ادب کے آسمان کے تابندہ ستارے ہیں۔"

ان کے علاوہ علی عباس حسینی، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا آزاد، ٹیگور، سرت چندر ڈاکٹر عابد حسین اور سیدین ان کے محبوب فنکار تھے۔ حالی اور انیس پر ان کی مستقل تصانیف ہیں خاص طور پر "یادگار حالی" اور "خواتین کربلا — کلام انیس کے آئینے میں" ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ پریم چند کی تحریر کی سادگی، خلوص اور حقیقت پسندی نے انھیں بے انتہا متاثر کیا۔ مولانا آزاد کی وہ بے حد معتقد تھیں کیونکہ ان کی تصنیف ترجمان القرآن نے زندگی کے کٹھن وقتوں میں سہارا دیا۔ اس علمی کارنامے کو وہ مولانا کا معجزہ تصور کرتی تھیں "غبار خاطر" بھی ان کی محبوب کتاب تھی۔ مولانا کی شخصیت سے بھی وہ بڑی متاثر تھیں چنانچہ ان کی شخصیت اور فن پر کئی مضامین لکھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین سے متاثر ہونے کی وجہ ان کی دل نواز شخصیت کے علاوہ ان کی تحریر کی دلکشی، سادگی و پرکاری ہے آپ کی ہی کہنے پر صالحہ بیگم بچوں کے ادب کی طرف متوجہ ہوئیں وہ چاہتی تھیں کہ ذاکر صاحب ان کی ہر کتاب کو پڑھیں اور اپنی رایے سے نوازیں مگر ان کی منصبی مصروفیات اس کی

اجازت نہ دیتیں تاہم ذاکر صاحب نے ان کی بیشتر کتابیں پڑھیں۔ "یادگار حالی" ان ہی کو معنون کی گئی ہے۔ دیگر نثاروں میں وہ ڈاکٹر عابد حسین، اور اپنے بھائی سیدین سے متاثر تھیں۔ درحقیقت یہی دو حضرات ہیں جنھوں نے مصنفہ کے ذوق مطالعہ و تصنیف کی آبیاری کی۔ اردو ادب میں صالحہ بیگم نے جو بھی مقام حاصل کیا اس کے پیچھے ان دونوں کی کوششوں کو کافی دخل ہے۔ علاوہ ازیں اردو کے سبھی معیاری شاعروں اور ادیبوں کو پڑھا مگر ان کے طرز تحریر کو اپنانے کی کبھی کوشش نہیں کی لکھتی ہیں۔

"میں نے شعوری طور پر کسی ادیب کی تقلید نہیں کی میرا مطالعہ میری شخصیت کا جز و بنتا رہا۔" ص ۱۲ "آج کل"

عصر حاضر کی لکھنے والیوں میں وہ قرۃ العین حیدر، رضیہ فصیح احمد، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور رضیہ سجاد ظہیر، جیلانی بانو، سلمیٰ صدیقی، شفیقہ فرحت، ہاجرہ نازلی، آمنہ ابوالحسن اور الطاف فاطمہ کو پسند کرتی تھیں۔ نئی نسل کی خواتین قلم کاروں میں رضیہ بٹ، عفت موہانی عطیہ پروین، مسرور جہاں، صغرا مہدی سے انھیں بڑی توقعات وابستہ تھیں۔

ادبی سرگرمیوں کے علاوہ صالحہ عابد حسین کی کئی غیر ادبی مصروفیات رہی ہیں مگر وقت کے ساتھ ساتھ ان میں تبدیلیاں اور کٹوتیاں ہوتی رہیں۔ کسی زمانے میں انھیں فوٹوگرافی، ہومیوپیتھی، سینے پرونے کاڑھنے بننے اور مختلف قسم کی دست کاریوں سے دلچسپی تھی چونکہ فوٹوگرافی اور ہومیوپیتھی مہنگے شوق تھے اس لیے انھیں ترک کر دیا۔ باغبانی اور آرائشِ مکان ایسے شوق تھے جو آخری وقت تک برقرار رہے۔ ابتدا ہی سے معمولی اور کم قیمت کی چیزوں سے گھر کو سجانے اور سنوارنے کا شوق تھا ان کے نزدیک ذوق کے لیے پیسوں کی ضرورت نہیں۔ طبیعت نفاست پسند پائی تھی اس لیے گھر کی بھی صفائی کا بڑا خیال رہتا تھا البتہ پکانے سے الجھتی تھیں بحالت مجبوری کچن میں جانا پڑ جائے تو الگ بات تھی۔ مذہب، عبادت اور مذہبی لٹریچر سے دلچسپی سدا سے بنی رہی۔ پڑھنے لکھنے اور ان مصروفیات سے جو وقت بچتا تھا وہ نوجوانوں کے مسائل کے لیے وقف کر دیا جاتا یعنی ان کی تعلیم تربیت، رہنمائی کیریئر بنانے اور شادی بیاہ کی فکر وغیرہ کرنے میں۔

علمی و ادبی میدان سے صرف نظر بیگم صاحبہ ایک مخصوص دائرہ کی سماجی اور تہذیبی سرگرمیوں کی روح رواں تھیں۔ بیس سال تک وہ جامعہ میں خواتین کی انجمنوں سے بحیثیت صدر یا سکریٹری وابستہ رہیں۔ علاوہ ازیں اوکھلا میں اور جامعہ میں سماج سدھار کام بھی کیا۔ جامعہ اردو، سیدین میموریل ٹرسٹ، انجمن ترقی اردو (ہند) کی مجلس عاملہ مرکزی انیس کمیٹی، ترقی اردو بورڈ، اسلام اینڈ ماڈرن ایج سوسائٹی وغیرہ کی سکریٹری یا رکن رہ چکی ہیں

مرکزی حکومت اور بعض ریاستی سرکاروں نے انھیں وقتاً فوقتاً انعامات وغیرہ سے ضرور نوازا۔ ان کی چند کتابیں یا ان کے اقتباسات خاص طور پر یادگار حالی، اپنی اپنی صلیب مختلف یونی ورسٹیوں اور سکنڈری ایجوکیشن بورڈ [بشمول مہاراشٹر] کی درسی کتابوں کے نصاب میں داخل ہیں۔

آمدنی کے وسائل محدود ہونے کے باوجود صالحہ عابد حسین نے جیسے تیسے کچھ اندرون ملک بیرون ملک کے اسفار کیے، ۱۹۶۱ء میں حج بیت اللہ اور زیارت مقدسہ کی خاطر سفر کیا۔

ادبی مسلک: صالحہ عابد حسین پریم چند اور علی عباس حسینی کے نظریۂ حیات سے بڑی متاثر ہوئیں اور اس کی وجہ بڑی سیدھی سادی ہے کہ مصنفہ بھی پریم چند کی طرح زندگی کے حقائق کو کہانی کا روپ دے کر صفحۂ قرطاس کے حوالے کرنے میں یقین رکھتی تھیں۔ وہ ادب کو محض تفریح یا دماغی عیاشی کا ایک ذریعہ خیال نہیں کرتی تھیں وہ ادب کو زندگی کا آئینہ تصور کرتی تھیں اس دنیا میں بسنے والے انسانوں کے دکھ سکھ ان کے مسائل ان کی فطرت اور ان کے جذبات و احساسات زندگی کی تلخیوں، خامیوں اور کمزوریوں کی ترجمانی ادب کے ذریعہ کرنا چاہتی تھیں ادب اور زندگی میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے یعنی وہ ادب برائے زندگی کی قائل تھیں جس طرح ان کے بزرگ مولانا حالی نے شاعری کو انسانوں اور جماعتوں کی اصلاح کرنے، انھیں خواب سے بیدار کرنے اور ان میں جوش و عمل پیدا کرنے کے لیے ایک نعرۂ انقلاب بنا کر پیش کیا اور اسے برتا اس معاملہ میں صالحہ عابد حسین ان کی حقیقی جانشین تھیں ان کی تحریروں سے واجبی سی واقفیت رکھنے والا شخص یہ کہہ اٹھے گا کہ ان کے ہاں ایک مخصوص نظریۂ حیات پایا جاتا ہے اور ان کی تحریریں مولانا حالی

کے بتلائے گئے مقاصد ادب کو پورا کرتی ہیں۔

ادب کی عظیم الشان عمارت کی بنیاد زندگی کی زمین میں گہرائی تک ہے اور زندگی کے بغیر صحیح آرٹ کا تصور نہیں کیا جاسکتا ان کا خیال تھا کہ۔

"ادب محض تخیل کی رنگین وادیوں میں بھٹکنے کا نام نہیں اس کی بنیاد ٹھوس زمین پر ہوتی ہے . . . . . میری اکثر کہانیاں اور ناول زندگی سے بہت قریب ہیں رص۱۵۱ "شاعر" شمارہ ۶۔۷،

گو کہ صالحہ عابد حسین نے اس صدی کے اوائل میں لکھنا شروع کیا مگر انھیں روایت سے چپکے رہنا پسند نہ تھا ان کے یہاں اس سے بغاوت بھی ملتی ہے اس طرح ان کے طرز تحریر اسٹائل اور خیالات میں قدیم وجدید کا سنگم نظر آتا ہے۔

انھوں نے کچھ کتابیں جرمن اور دیگر ہندستانی زبانوں سے ترجمہ کیں خصوصاً بچوں کے لیے۔ خود ان کی دو کتابوں کے ترجمے ہندی میں ہوئے ایک "مہاکوی انیس" اور دوسری انیس کے مراثی کا انتخاب۔ ان کی بعض کتابیں پاکستان میں بھی شائع ہوئیں بعض باقاعدہ ان کی اجازت سے اور بعض ان کی لاعلمی میں۔

بیگم صالحہ تقریباً نصف صدی سے مختلف موضوعات پر لکھ رہی تھیں اور وہ زود نویس بھی تھیں لہٰذا جو کچھ شائع ہوا ہے اس سے کہیں زیادہ چیزیں اِدھر اُدھر غیر مطبوعہ حالت میں بکھری پڑی ہیں نیز اچھی خاصی تعداد میں ضائع بھی ہوگئیں۔

مختصر جائزہ: صالحہ عابد حسین متوسط طبقے کی گھریلو معاشرت اور زندگی کے المیہ کو پیش کرنے میں امتیاز رکھتی ہیں۔ ان کے موضوعات گنے چُنے ہی ہوا کرتے ہیں۔ ہندستانی عورت، سیاست، تعلیم، ملک کی حالت، عورت کا گھریلو ماحول وغیرہ جہاں ایک طرف سرور وانبساط کا سبب بنتے ہیں وہیں زندگی کا سلیقہ پیدا کرتے ہیں۔ ان کا قلم صرف گھریلو زندگی کی عکاسی تک محدود نہیں تھا بلکہ ہندستان کی سیاسی اور اقتصادی صورت حال، سماجی ماحول، طبقاتی نظام اور سماج کے تضاد اور آویزش، اقدار کے ٹکراؤ ان کی شکست وریخت اور اس پس منظر میں عوامی زندگی کے عمل اور ردِّ عمل وغیرہ پر بخوبی چلتا تھا۔ انسان کے دکھ سکھ خاص طور پر ہندستانی عورت کی تصویر کشی اور نئے ہندستان میں اس کے رول سے بھی ان کا قلم بحث کرتا تھا۔ ان کے ہاں خطابت یا جذباتیت

کی چاشنی نہیں ملتی۔ ان کی کہانیوں میں عشق چٹپٹا، سستا اور بازاری قسم کا نہیں ان کے کردار خصوصاً ان کی ہیروئین شوخ وطرار نہیں وہ ظاہری خوبیاں کے بجائے باطنی اوصاف سے متصف ہوتی ہے ان کی تحریروں میں محبت خصوصاً ممتا مختلف روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے انسانی فطرت خصوصاً نسوانی فطرت کا مطالعہ ومشاہدہ ملتا ہے۔ ان کے ہاں یادوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور عام ڈگر سے ہٹ کر بھائی اور بہن کو بھی مرکزی کردار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کے افسانوں، کہانیوں اور ناولوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ یہ تقریباً ان ہی موضوعات کے گرد گھومتے ہیں۔ عذرا، آتش خاموش اور راہ عمل کی کہانیوں قطرے سے گہر ہونے تک میں اپنے ارتقا کو پہنچ گئی ہیں۔ ان میں عورت کی سیرت اور اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے بحث ملتی ہے۔ "اپنی اپنی صلیب" میں محبت، زندگی کے مصائب اور انسانی بیکسی ولاچاری کا فنکارانہ اظہار ہے۔ "الجھی ڈور" اور "گوری سوئے سیج پر" میں جدید وقدیم نظریات کی آویزش اور ان سے جنم لیتی ہوئی نئی اقدار کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ان کے نتائج نہ صرف بصیرت افروز ہیں بلکہ عبرت ناک بھی۔ ان مرکزی مسائل کے علاوہ زندگی کی بعض حتمی تلخیوں کا بھی ذکر ملتا ہے جیسے عورت کے بنیادی حقوق (خصوصاً اسلامی حقوق) ہپی ازم، اقتصادی زبوں حالی، کرداری گراوٹ بوڑھوں کے مسائل، تلاش معاش کے لیے ہندستانی نوجوانوں کا غیر ملکوں کو کوچ اور اس سے متعلقہ مسائل وغیرہ۔

صالحہ عابد حسین نے خاکہ نگاری اور تنقید کے میدان میں بھی گراں قدر خدمات انجام دیں مگر بحیثیت ناول نگار اور افسانہ نویس ان کا درجہ بہت بلند ہے حالانکہ ان کی محض تین کتابیں "یادگار حالی، جانے والوں کی یاد آتی ہے اور خواتین کربلا ہی ان کی شہرت دوام کے لیے کافی ہیں۔

بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں میں ایکتا، اتحاد آپسی میل ملاپ اور باہمی محبت پر زور دیا گیا ہے بعض مفید کتابوں کے ترجمے بھی دوسری زبانوں سے کیے ہیں۔ ویسے بڑی عمر کے قاری بھی ان کتابوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

عام طور پر نقادوں نے ان کی خدمات کو اس حد تک نہیں سراہا جس کی وہ مستحق تھیں۔ عموماً ناقدین ان پر غیر ضروری تفصیل اور جزئیات نگاری کا الزام لگاتے ہیں، بعض کو ڈرامائی

تحیر اور سسپنس کی کمی کا گلہ ہے اور کچھ کے نزدیک یادوں کی بہتات ان کی تحریروں کو یکسانیت کا شکار بنا دیتی ہے تاہم اردو کے کافی ناقدین نے ان کی کاوشوں کو سراہا ہے۔ چند نام یہ ہیں وقار عظیم، پروفیسر احتشام حسین، آل احمد سرور، خلیق انجم، عنوان چشتی، سیدہ جعفر، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، حیات اللہ انصاری، اسلوب احمد انصاری، احمد ندیم قاسمی، گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر کبیر جائسی، انور کمال حسینی، ڈاکٹر سیفی پریمی، ڈاکٹر زرینہ ثانی وغیرہ۔

صالحہ عابد حسین سیدھی سادی زبان لکھنے کی قائل تھیں جو ادبی چاشنی سے عاری نہ ہو وہ اپنی تحریر میں خواہ مخواہ حوالہ جات اور بھاری بھرکم الفاظ کے استعمال سے قاری کو مرعوب کرنا معیوب سمجھتی تھیں۔ طرز تحریر تکلف، تصنع اور صنائع بدائع سے پاک تھا۔ الفاظ ایسے استعمال کیے جاتے تھے جو سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں اس کے متعلق بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ حالی کے خاندان کی زبان ہے۔

نزہت فاطمہ

صالحہ عابد حسین

موت کو کس نے بے حجاب کہیں — کس کو معلوم کیا حجاب میں ہے
جسم و جاں کا یہ عارضی رشتہ — کتنا ملتا ہوا حباب میں ہے
آج جو ہے وہ کل نہیں ہوگا — آدمی کون سے حساب میں ہے

(جاں نثار اختر)

"اردو کی جانی مانی لیکھیکا بیگم صالحہ عابد حسین کا دلی میں دیہانت ہو گیا۔"
ٹیلی ویژن پر یہ خبر بڑی غیر متوقع لگی — صالحہ آپا کا انتقال ہو گیا۔
چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ حقیقت کو اپنی آنکھوں سے اچھی طرح دیکھا لیکن
دل کسی طور پر یقین کرنے کو نہیں تیار ہوتا

صالحہ آپا جنھیں ہم بہت پیار سے "آپا" کہا کرتے تھے۔ جس پر وہ اعتراض بھی کیا کرتی تھیں کہ "تم میری بہن نہیں بیٹی کے برابر ہو" ان کی موت بے شک ایک چاہنے والی ہستی ایک بہت قریب عزیز کی موت تھی۔ یہ سب ٹھیک ہے کہ وہ بیمار رہا کرتی تھیں صحت بھی کافی گر گئی تھی۔ عمر کا تقاضا بھی تھا اور سب سے بڑی بات حکم خداوندی تھا لیکن ے

"یہ دل نہیں تیار ترے ماتم کو"

ذہن میں یادوں کے عکس ابھرنے لگے ملاقاتیں یاد آنے لگیں، تصور رفتہ رفتہ اک سراپا بنتا جا رہا ہے۔ اس وقت سامنے جو بیوی بیٹھی ہیں وہ ایک گھریلو خاتون ہیں کوئی دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ ایک عظیم فنکار ہیں ایک ناول نگار ہیں اور ایک ادیب ہیں۔ مناسب ناک نقشہ، گندمی رنگت، ذہین و چمکتی ہوئی آنکھیں، سلیقہ سے گندھی ہوئی چوٹی ویسے سراپا میں کوئی ایسی خاص بات نہیں کہ جس جا نظر کھیچے عمر دہیں بسر کرنے کی آرزو پیدا ہو جائے

لیکن ذرا نزدیک سے دیکھیے تو کیا کچھ ملتا ہے بھولا پن، انسان دوستی، نیک نفسی، ذہانت اور یہ سب اس طرح یکجا ہوتے ہیں کہ بیگم صالحہ عابد حسین خاصہ کی چیز بن جاتی ہیں۔

صالحہ آپا کی شخصیت میں سادگی اور دردمندی کا جوہر اتنا نمایاں ہے کہ اس کو لمحہ بھر بھی ان سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ بعض بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ شاعر یا ادیب اپنی شخصیت کو اتنے پردوں میں چھپا لیتا ہے کہ اس کی تحریر سے بھی اس کی شخصیت کی جھلک نظر نہیں آتی لیکن صالحہ آپا کا معاملہ دوسرا ہے۔ جس نے انھیں دیکھا ہے اس کی بات الگ، جس نے نہیں بھی دیکھا وہ ان کی کتابوں خصوصاً ناولوں کے ذریعہ ان کی شخصیت کے جوہر دیکھ سکتا ہے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا وہی زندگی بھر کیا بھی ان کی تحریریں ان کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ ان کے کردار بلند اور عظیم ہیں تو یہ افسانوی مبالغہ نہیں ہے بلکہ ذاتی طور پر وہ ایسے لوگوں سے ملی ہیں متاثر ہوئی ہیں۔ اور ان کا سابقہ ایسے ہی لوگوں سے پڑا جسے وہ اپنی خوش نصیبی سمجھتی تھیں۔

بیگم صالحہ عابد حسین مولانا حالؔی کی پرنواسی خواجہ اخلاق حسین کی نواسی خواجہ غلام الثقلین جیسے جیّد عالم کی صاحبزادی تھیں۔ ان بزرگوں کی صحبت انھیں نہیں ملی اور ملی بھی تو بہت ہی کم لیکن انھوں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اس میں ان بزرگوں کے جوہر رچے بسے تھے پھر آگے چل کر سیدین صاحب کی سرپرستی اور محبت اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب کی رفاقت نے اس میں چار چاند لگا دیے۔ صالحہ آپا فطری طور پر فنکار تھیں انھیں پکنک کا بھی شوق تھا باغبانی کا سلیقہ بھی تھا۔ اور فوٹو گرافی سے بھی دلچسپی تھی۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ لکھنے کا ہنر انھیں گھٹی میں ملا تھا تو کچھ بے جا نہ ہوگا انھوں نے بہت ہی کم سنی سے لکھنا شروع کر دیا تھا صالحہ آپا کا گھرانا نہ صرف علم دوستی بلکہ کئی حیثیتوں سے ممتاز تھا تقریباً آٹھ نو سال پہلے انصاریوں کا یہ خاندان ہرات سے پانی پت آکر بس گیا تھا۔ اس خاندان میں بہت سے علما و فضلا پیدا ہوئے۔ کچھ گم نامی میں چھپ گئے اور کچھ مشہور ہو گئے ان میں مولانا الطاف حسین حالؔی بھی تھے۔

صالحہ آپا کا خاندان ادب کا گہوارہ اور تہذیب و شائستگی کا مسکن تھا ان کی والدہ مشتاق فاطمہ مولانا حالی کی سگی پوتی تھیں۔ اس زمانے میں جب عورتوں میں تعلیم کا رواج نہیں تھا صالحہ آپا کی والدہ خالائیں اور پھپھیاں پڑھی لکھی تھیں گھر میں چھوٹی سی لائبریری تھی۔ جس میں خواتین کی دلچسپی کے کتابوں کے علاوہ علمی مذہبی اور ادبی کتابوں کا ذخیرہ تھا۔

خواجہ غلام الحسنین صاحب (صالحہ آپا کے چچا) خود بڑے پایے کے عالم تھے اور علم و ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ اس ماحول میں صالحہ آپا کی پرورش اور تعلیم ہوئی۔

قدرت کی طرف سے وہ حساس دل لے کر پیدا ہوئی تھیں۔ جو مرض کی طرح ان سے چمٹا رہا۔ یہ دل ان کا رفیق بھی تھا اور دشمن بھی اس دل نے ان کو غم میں سنبھلنے کے موقع بھی دیے۔ اور غم کو شدت سے محسوس کرنا بھی سکھایا۔ ان کی زندگی پر نظر ڈالیے تو غم کی دھوپ زیادہ کڑی ہے۔ اور خوشی کے سایے مدھم مدھم ہیں۔ اسی ماحول میں وہ پیدا ہوئیں۔ اسی میں پلی بڑھیں جوان ہوئیں۔ اور اسی ماحول میں انھوں نے زندگی کو الوداع کہا۔

والد، والدہ، جوان بہن سب کا غم کم سنی میں اٹھایا۔ حد سے زیادہ شفیق چچا کی رحلت کا داغ سہا۔ بھائی کا غم برداشت کیا پھر عابد صاحب کی موت کا داغ سینے پر سجائے وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔

عابد صاحب سے شادی کے بعد وہ حقیقی معنوں میں خوشی سے آشنا ہوئی تھیں۔ ہنستے مسکراتے زندگی گزر جانے کی امید پیدا ہوئی تھی کہ اچانک زندگی نے ماتمی بگل بجا دیا۔ یوں ہوا کہ پہلا اور آخری بچہ پیدا ہوا۔ اور چل بسا صالحہ آپا بے ہوش تھیں اسے دیکھ بھی نہیں سکیں جب ہوش آیا تو اپنی تہیدستی کا احساس ہوا اور یہ تلخ حقیقت سنی اور برداشت کی کہ وہ کبھی ماں نہیں بن سکیں گی۔ یہ محرومی معمولی نہیں تھی۔ بقول میر انیسؔ ؎

"دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے"

اس منزل پر آکر وہ کس طرح سنبھلیں یہ بھی ایک طرح سے ان کا جہاد تھا۔ کیونکہ فطری طور پر وہ "ماں" کا دل لے کر پیدا ہوئی تھیں۔ قدرت نے ان کو یہ عظیم شے یعنی "دل مادر" تو عطا کی تھی لیکن ان کی گود اس وجود سے محروم رکھی تھی جس وجود کا مسکن ماں کا دل ہوا کرتا ہے۔ یہیں پر آکر انھوں نے سوچا غور کیا اور پھر اپنے خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر اس غم کو بھلانے کی سعی کی جب وہ اپنے ناولوں میں بچے کا ذکر کرتی ہیں تو ممتا کا جام چھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور ان کی شخصیت پر چڑھی ہوئی تمام تہیں تمام پرتیں اترنے لگتی ہیں۔ اور بیگم صالحہ عابد حسین ماں صرف ماں بن جاتی ہیں۔

اپنے ناول "قطرے سے گہر ہونے تک" میں وہ جس انداز سے انیسؔ کی زبانی بچے کا ذکر کرتی ہیں۔ وہ آپ بیتی نظر آنے لگتا ہے۔ لکھتی ہیں "اور اگلے دن اس ننھے بچے نے ہمیشہ کے لیے

آنکھیں بند کرلیں شاید وہ صرف اسی انتظار میں اب تک زندہ رہا تھا کہ ایک بار اس کی ماں نظر بھر کر دیکھ لے تاکہ وہ اس کی پتلیوں میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہ سکے۔"

وہ بچہ بے شک صالحہ عابد حسین کے ناول کے کردار کا بچہ ہے۔ لیکن خود صالحہ آپا میں اور دل میں بھی ہمیشہ وہ بچہ زندہ رہا اور ان کو یہ احساس دلاتا رہا کہ وہ "ماں" ہیں۔ اس کے نتیجے میں صالحہ آپا زندگی بھر بے ماں کے بچوں بے آسرا بچوں غمگین بچوں کو دوسروں کے بچوں کو سینے سے لگائے رہیں۔ ان بچوں کے دکھ درد خوشی و غم ان کی تعلیم غرض ہر چیز میں گم ہوگئیں اور ان سب میں ایسی رچ بس گئیں کہ حقیقتاً وہ ان کی "اماں" بن گئیں۔ آج ان کو اماں کہہ کر پکارنے والوں کی تعداد ماشاءاللہ خاصی ہوگئی ہے۔

اگر غور کیا جائے تو یہ معمولی بات نہیں ہے زبان سے کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے اور صالحہ آپا نے یہ فرق مٹا دیا وہی کیا جو کہا۔ یہیں پر ان کی شخصیت کا جوہر کھل کر سامنے آتا ہے۔ جس میں دردمندی بھی ہے۔ اور حوصلہ بھی اور اندازہ ہوتا ہے کہ غموں کی آنچ میں پگھلنے کی وجہ سے صالحہ آپا غم زدہ تو ہوئیں لیکن غم پرست نہیں بن سکیں۔ اسی لیے ان کی تحریروں میں غم کی دھیمی دھیمی لو ہے جو زندگی کو عزم و حوصلہ تو عطا کرتی ہے لیکن زندگی کو غم زدہ نہیں بناتی۔

ان کی تحریروں میں انداز بیان کا حسن پایا جاتا ہے۔ مکالموں کی زبان اور ادائیگی کا شعور بہت پختہ ہے ان کے مکالمے بڑے جاندار ہوتے ہیں اور بڑی گھریلو فضا پیدا کرتے ہیں۔

یہی حال واقعہ نگاری کا بھی ہے۔ یوں تو ناول کا ہر حصہ واقعہ نگاری یا واقعات کی بازآفرینی کا مظہر ہوتا ہے لیکن اس میں حقیقت نگاری کی اہمیت زیادہ نظر آتی ہے۔ صالحہ آپا نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا دکھ سکھ رنج و غم، نامرادی، ناکامی اور سرشاری ہر قسم کے دور سے وہ گزری تھیں۔ انھیں غم روزگار بھی ملا تھا اور غم حیات اور ساتھ ہی ان سب کو برتنے کا حوصلہ ان میں تھا اور بیان کرنے کا ہنر بھی اسی لیے ان کا بیان پُر اثر ہو جاتا ہے۔

ہر ناول نگار بلکہ ہر انسان زندگی کو اپنے خاص نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اسی کا وہ بیان کرتا ہے اور اسی سے اس کے فلسفۂ حیات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے صالحہ آپا کا ذہن آزادی کی جدوجہد، گاندھی جی، مولانا آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، خواجہ غلام السیدین کے گرد

گھومتا ہے یہ لوگ وہ لوگ تھے جن میں خلوص، ایثار، تن من دھن نچھاور کرنے کا جذبہ تھا دوسروں کو کچھ دینے کی خواہش تھی آشتی اور صلح کے تو یہ لوگ پیغمبر کہے جا سکتے ہیں ان سب کا اثر صالحہ آپا پر بہت پڑا اور اسی کا عکس ان کی تحریروں میں نمایاں ہے ان کے تنقید نگار تحریری طور پر نہ سہی زبانی یہ کہتے سنے گئے ہیں کہ ان کے یہاں آدرش کا پرچار اتنا ہے کہ گراں گزرنے لگتا ہے۔ اور ان کے کردار زمین کے نہیں آسمان کے پاس لگتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ان کے ارد گرد تھے وہی ان کے ہیرو کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ اور وہ لوگ واقعی بے نفسی اور ایثار کا مجسّمہ تھے۔

آرنلڈ بینٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "ناول نگار وہ ہے جو زندگی کا غائر مطالعہ کرے اور اس سے اس قدر متاثر ہو کہ وہ اپنے مشاہدے کا حال دوسروں سے بیان کیے بغیر نہ رہ سکے اور اپنے جذبات کے اظہار کے لیے قصّہ گوئی کو سب سے زیادہ موزوں و مناسب ذریعۂ آرٹ سمجھے" اور تقریباً یہی صالحہ آپا نے کیا۔

صالحہ آپا کی شخصیت کی طرح ان کی زبان نرم اور شیریں تھی اس میں سلاست اور روانی بھی ہے۔ خود ذاتی طور پر بھی وہ نرم دل تھیں، اگر کبھی گرم گفتگو ہوتیں تو اس وقت جب دوسرے فریق کو جھوٹ بولتے دیکھتی تھیں لیکن یہ وصف بھی ان میں تھا کہ اگر اندازہ ہو جائے کہ دوسرا فریق غلطی پر نہیں ہے تو وہ معافی مانگنے میں ذرا سا نہیں جھجکتی تھیں خواہ مخالف فریق مرتبہ اور عمر میں ان سے کتنا ہی کم کیوں نہ ہو۔ اس بات کا تجربہ ذاتی طور پر خود ہمیں بھی ہوا ہے۔

صالحہ آپا کا پہلا ناول "حسن اتفاق" جو حسن اتفاق ہی ہے کہ چھپ نہیں سکا یہ ناول انھوں نے بہت کم سنی میں لکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے لکھنے کی ابتدا آٹھ یا نو سال کے سن سے ہوئی ان کے مضامین پھول اور تہذیب نسواں میں چھپا کرتے تھے۔ اس کے بعد کہانیوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۳۹ء میں چھپا۔ جو نقش اول تھا اس کے بعد لکھنے کا سلسلہ چلتا رہا ۱۹۴۲ء میں ان کا پہلا ناول "عذرا" چھپا فنی تکمیل کے لحاظ سے یہ ان کی کامیاب تصنیف ہے۔ "آتش خاموش" مئی ۱۹۴۷ء کے اوائل میں لکھا گیا اور فروری ۱۹۵۳ء شائع ہوا۔

"قطرہ سے گہر ہونے تک" اس ناول پر انھیں یوپی گورنمنٹ سے انعام بھی ملا۔ اس کا شمار ان کے بہترین ناولوں میں کیا جا سکتا ہے۔ یہ ناول ۱۹۵۰ء میں چھپا۔

چوتھا ناول "راہِ عمل" ستمبر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا جس کے بارے میں احتشام صاحب

کا کہنا ہے۔ "میرے خیال میں ناول بہت زیادہ واضح طور پر مقصدی ہونے کے باوجود دلچسپ ہے اور اس کا مقصد ناول نگار کے خلوص اور اندازِ بیان میں پوشیدہ ہے"۔

"یادوں کے چراغ" ۱۹۶۶ء میں چھپا اس ناول کو ان کے نقادوں نے بہتر اضافہ کا نام دیا۔ اور بقول ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری۔ "یادوں کے چراغ" مصنفہ کے پچھلے کارناموں پر ایک قابل قدر اضافہ ہے" "اپنی اپنی صلیب" اس کے بارے میں حیات اللہ انصاری صاحب کا کہنا ہے کہ "مصنفہ اردو کی جانی پہچانی ناول نگار ہیں ان کی زبان تو ہوتی ہی اچھی ہے لیکن اس ناول میں تو خاصا میٹھا پن ہے اس وجہ سے عبارت میں میدانی ندیوں کی طرح پر سکون روانی ہے جس کو کسی رکاوٹ سے سابقہ نہیں پڑا"۔

"اپنی اپنی صلیب" کے بعد "الجھی ڈور" کا نمبر آتا ہے خاصی جیتی جاگتی کہانی ہے۔ اس میں موجودہ دور کی عکاسی بھی گئی ہے اس کے بارے میں خود صالحہ آپا کا کہنا ہے کہ "یہ میرا پہلا مختصر ناول جسے آج کل ناولٹ کہا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ناولٹ کی نثر تیب و ترکیب کی تکنیک کچھ اور ہوتی ہو مگر میں ٹکنیک کی غلام کبھی نہیں بنی"۔

"ساتواں آنگن" شاید صالحہ آپا کا آخری ناول ہے جس میں مذہبی رجحان زیادہ ہے یہ ناول اس منزل پر آکر انھوں نے لکھا ہے، جب آدمی پیچھے کی طرف مڑکر دیکھنے لگتا ہے۔ یا عینی آپا کی زبان میں کہا جا سکتا ہے کہ اپنے ٹائپ پر واپس آجاتا ہے۔ اس ناول میں صالحہ آپا ایک گھریلو اور مذہبی بیوی کے طور پر زیادہ نمایاں ہیں۔ ویسے وہ فطرتاً مذہبی تھیں لیکن عمر کے اس دور میں ہر مذہب کے ماننے والوں میں شدت احساس بڑھ جاتا ہے۔ وہی احساس صالحہ آپا کے یہاں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

ناولوں کے علاوہ صالحہ آپا نے افسانے بھی لکھے "نقشِ اوّل" "سازِ ہستی" "نراس میں آس" "لو نگے" "دَرد و درماں" وغیرہ۔

تنقیدی کتابوں میں "خواتین کربلا کلام انیس کے آئینے میں" "ادبی جھلکیاں" "انیس سے تعارف" "انتخاب مراثی انیس" "بات چیت" "جانے والوں کی یاد آتی ہے" وغیرہ۔

صالحہ آپا کے ڈرامے اکثر سٹیج بھی ہوئے ہیں "زندگی کے کھیل" "امتحان" "عفت" "بنیادی حق" "حالی کی جھلک" اس کے علاوہ انھوں نے سوانحی حالات بھی لکھے "یادگار حالی" کے نام سے مولانا حالی کی سوانح عمری لکھی اس کے علاوہ "ذکر جمیل" کے نام سے خواجہ السیدین کی ادھوری

خود نوشت کو مکمل کیا۔ اور خود اپنی سوانح عمری "سلسلۂ روز و شب" کے نام سے لکھی۔

صالحہ آپا نے وطن اور بیرونِ وطن کے کافی سفر کیے تھے۔ انھوں نے اپنا سفر نامہ "سفر زندگی کے لیے سوز و ساز" کے نام سے ترتیب دیا۔ "سلک گہر" کے نام سے مذہبی مضمون بھی لکھے۔ جس میں انھوں نے بزرگانِ دین کی سیرت کے وہ رخ پیش کیے ہیں جو ہمیشہ زندہ و پایندہ رہیں گے۔ صالحہ آپا بہت زیادہ مذہبی تھیں دوسرے معنوں میں سچی مذہبی کیونکہ اوّل تو وہ تعصب سے دور تھیں دوسری طرف اپنے مذہب کی پوری طرح پابند و فادار تھیں۔ ایک جگہ لکھتی ہیں "ایمان کی قوت اور عقیدے کی مضبوطی صرف یہی ایک چیز ہے جو سخت سے سخت وقت میں آدمی کو سنبھالتی اور سہارا دیتی ہے" ایمان کی یہ پختگی انھیں اپنے چچا خواجہ غلام الحسنین صاحب سے ملی تھیں۔ جن کے بارے میں وہ لکھتی ہیں۔

"ایک اور شخصیت میرے بڑے چچا خواجہ غلام الحسنین کی ہے جس نے میرے مذہبی عقیدوں اور اسلام کے تصور پر بہت اثر چھوڑا ہے۔ وہ بہت بڑے عالم دین تھے جنھوں نے اسلام کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ اس کی روح کو سمجھ کر اس کی صحیح تعلیم دینے کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا تھا۔ لیکن ان کا دامن ایسی تنگ نظری اور تعصب سے پاک تھا جو عام طور پر مذہبی لوگوں میں پایا جاتا ہے۔"

صالحہ آپا مولانا آزاد کی بہت معتقد تھیں۔ ان کا کہنا تھا "یوں تو میں نے قریب قریب ان کی سبھی تصانیف پڑھی ہیں۔ غبار خاطر نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے لیکن ان کی جس تصنیف نے میرے دل میں ان کی عظمت ولیوں کی سی پیدا کر دی ہے وہ "تفسیر سورہ فاتحہ" اور "ترجمان القرآن" ہے۔

صالحہ آپا نے بچوں کے لیے بھی لکھا ہے۔ "سنہری بالوں والے بچوں کا دیس" "بہادر سند" "بھولی" "جادو کا ہرن" "سندر چنار" "بچوں کے انیس" وغیرہ۔

صالحہ آپا نے زندگی کی ابتدا کے ساتھ لکھنے کی ابتدا کی اور زندگی بھر لکھتی رہیں۔ بہت کچھ لکھا لیکن مجھے یہ کہنے میں جھجک نہیں محسوس ہوتی کہ وہ فطری طور پر ناول نگار تھیں۔ ان کو جو شہرت اور مقبولیت ملی اس میں ان کے ناولوں کا حصہ زیادہ ہے۔ جب جب بھی اردو ناول کی تاریخ لکھی جائے گی اس میں صالحہ آپا کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہوگا۔

وہ ندیم و مطرب و ساقی کہاں گم ہو گیا　　　خلوتوں کی انجمن آرائیاں جاتی رہیں

شائستہ اکرام اللہ

صالحہ عابد حسین کا فن نقادوں کی نظروں میں

عذرا۔ بہت دنوں کے بعد مجھے ایک ایسی کتاب کے پڑھنے کا اتفاق ہوا جس کے متعلق سچائی سے میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ شروع کرنے کے بعد ختم کیے بغیر نہ رہ سکی۔ یہ کتاب صالحہ عابد حسین کا ناول "عذرا" ہے۔

عذرا میں مسلمانوں کے غدر کے بعد کی معاشرت کی تصویر اور اس معاشرت کی جس میں پرانی تہذیب و پرانا طور طریقے پرانی وضعداری کی شان قائم تھی، لیکن جس میں آہستہ آہستہ غیر معلوم طور پر نئے رجحانات کا اثر ہو رہا تھا۔ اس نئے اثر سے کس طرح بتدریج معاشرت بدلتی ہے یہاں تک کہ کہاں تو کھڑکی سے جھانکنا معیوب سمجھا جاتا تھا کہاں اسی لڑکی کو اخبار منگانے تک کی آزادی مل جاتی ہے۔ اس بتدریج تبدیلی کو بڑی خوبی سے دکھایا ہے بغیر کسی لمبی چوڑی تمہید کے بغیر قصّہ کی سلاست یا روانی پر کسی طرح کا اثر ڈالے ہوئے معاشرت آپ کو اس طرح سے بدلتی ہوئی نظر آتی ہے جس طرح صبح کاذب سے صبح صادق یعنی دیکھتے ہی دیکھتے سماں بدل جاتا ہے۔

یوپی کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں ایک شریف متوسط حال گھرانے کی زندگی بس یہ کل قصّے کا سرمایہ ہے، لیکن لکھنے کا انداز ایسا دل نشین ہے زبان اتنی صاف ہے اور کردار نگاری اور قوت مشاہدہ اتنی اچھی ہے کہ تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے اور اسی تگ و دو کا زمانہ اس پُرسکون زمانہ کی تصویر بھی باعث تسکین ہوتی ہے۔ نسیمہ خاتون

کے کردار میں اترتی ہوئی دھوپ کی سی خوشگواری ہے وہ نیک ہیں صحیح اور سچے معنوں میں نیک۔ ان کی نیکی بے جان یا دوسروں کے لیے عذابِ جان قسم کی نہیں ہے بلکہ اپنے اور غیر سب کے لیے فرشتۂ رحمت ہیں خاندان محلّہ بلکہ قصبہ بھر ان کی عزّت کرتا ہے۔ ان کے بچے ان سے دل سے محبّت کرتے ہیں اور ماں کی عظمت کا گہرا نقش ان کے دل میں بیٹھا ہوا ہے ہر ایک کے بُرے بھلے میں کام آنا ہر ایک کے دُکھ سکھ میں ساتھ دینا ان کا شیوہ، اس لیے لوگ بھی اُن سے محبّت کرتے ہیں اور باوجود غربت کے ان کی اور ان کی اولاد کی ساکھ سارے کنبہ میں بیٹھی ہوئی ہے ان کی بہن جمیلہ خاتون کا کردار ان کے کردار بر عکس ہے، ان کی بد مزاجی۔ تنگ دلی اور ساتھ ہی سچی محبت بھی بہت خوبی سے دکھائی ہے، یہ محبّت کس طرح چھوٹی چھوٹی باتوں سے ظاہر ہوتی ہے جیسے عذرا کے روزے کے دن سحری کے لیے جلیبیاں بھیجیں، جمیل کا پیام نامنظور کرنے کی وجہ سے نسیمہ خاتون سے خفا ہیں۔ عذرا میں ہزاروں کیڑے ڈالتی ہیں لیکن جب نسیمہ بیمار پڑتی ہیں تو دل جان سے خدمت کرتی ہیں۔ اور پھر ان کے مرنے کے بعد جب عذرا کی طرف سے بالکل ہی مایوس ہو جاتی ہیں اور بہت کچھ سخت سُست کہتی ہیں تب بھی یہ کہنے سے کہ اس کے لیے برسوں کا رکھا ہوا جوڑا اور زیور بھیج دوں گی، محبّت کی دبی ہوئی چنگاری نظر آتی ہے۔ ہمارے پرانے ناول نگاروں کا سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ وہ لوگوں کو نیکی کا فرشتہ اور یا شیطان مجسّم بنا دیتے ہیں لیکن عذرا میں نسیمہ خاتون باوجود انتہا درجے کے نیک ہونے کے بے جان ہستی نہیں اور جمیلہ خاتون باوجود انتہائی اکھل کھری ہونے کے بدنیت یا بری نہیں دکھائی گئی ہیں۔ ان کی طرح بد مزاج عورت ہر خاندان میں پائی جاتی ہے جس کے مسلسل اعتراض سے خاندان کی ہر لڑکی پناہ مانگتی ہے، نیکی اور بُرائی کا یہی توازن مسز نسیم رضیہ وغیرہ کے کردار میں دکھایا گیا ہے فرخ گرچہ نسیمہ خاتون کی بیٹی ہے اور عذرا کی بہن لیکن ان کی نسبت زیادہ دنیادار اور دنیا کے کہنے سننے کی پروا کرنے والی ہے لیکن اپنے عزیزوں اور ماں سے محبت اس کے کردار کا سب سے روشن پہلو ہے ریاض ہی ایک کیریکٹر ہے جو کہ حقیقت کی حد سے نکل گیا ہے اور مثالی کردار ہے لیکن اس کو بیوہ ماں اور تین یتیم بہنوں کی نظر

سے دیکھیے، جن کا کہ وہ واحد چشم و چراغ، ان کی زندگی کا ایک سہارا، ان کی امیدوں کا مرکز تھا۔ اس کا کیریکٹر اُن کی نظر کے سامنے پیش کیا گیا ہے، زندہ دلی، جوش اور استقامت ہے، ساتھ ہی خودسری اور خودبینی، ہاجرہ حبیب الٰہی سیدہ اصغر غیر اہم کردار ہیں لیکن سب کی انفرادی ہستی قائم رہتی ہے عذرا کا کیریکٹر کتاب کی جان ہے، اسی شوخ و شریر لڑکی کے دل میں خیالات کا تموج اور جذبات کی فراوانی ہے ہندستانی معاشرت کی رکاوٹیں اس کی طبع آزاد کو سخت گراں گزرتی ہیں، پڑھنے کی آرزو، ذہنی ارتقا اور نشو و نما کی خواہش، روپے کی کمی اور دوسری مجبوریوں کے سبب سے شرمندۂ تکمیل نہیں ہوتی جس سے کہ کیریکٹر میں ایک حزنیہ جز ہے۔ ماں کی تعلیم اور ماں کے لحاظ سے اپنی طبیعت کے بے لگام رہوار کو بہت کچھ روکنے کی کوشش کرتی ہے اس کی عقل اور اس کا ضمیر ان باتوں کو غلط نہیں سمجھتا۔ تاہم اس خیال سے تنگ نظر خالہ اور چچی ماں کو طعنہ کا نشانہ بنائیں گی انصار سے معمولی خط کتابت تک رکھنے کی روادار نہیں ہوتی جس کا نتیجہ بربادی ہوتے ہوتے رہ جاتا ہے۔

قصہ کا پلاٹ کمزور ہے اور ہندستانی معاشرت کے جس دور کا یہ ناول ہے اس میں اور ہوتا بھی کیا چار دیواری کے اندر ایسے ماحول میں جہاں شلوار پہننا عیب اور ساڑھی پہننا گناہ ہو پانچوں وقت نماز کی پابند، شب بیدار اور تلاوتِ قرآن کرنے والی، سیدھی سادی ماں کے زیر سایہ پلی ہوئی لڑکیوں کی زندگی میں بھلا پیچیدہ عشقیہ معاملات کس طرح پیش آ سکتے ہیں ویسے زور قلم سے تصنیف کر دیے جائیں تو اور بات ہے لیکن جس ماحول میں عذرا پلتی ہے اور جیسی تعلیم تربیت اسے ملتی ہے اس کو دیکھتے ہوئے اس کی زندگی میں اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ شادی کے خواہش مند انکار سے ناراض ہو کر اس کی شادی میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کریں اور اس سے کچھ پیچیدگی پیدا ہو جائے، خواتین کے لکھے ہوئے ناول کا یہ پسندیدہ موضوع ہے اور میرے خیال میں اس رعایت سے مغربی ناول کو دیکھتے ہوئے کچھ تھوڑی بہت پیچیدگی تو پیدا کرنی ضرور ہے ورنہ جس طرح کی زندگی کی عذرا میں عکاسی ہے وہ تو یکسر رنگ و دو سے خالی ہوتی تھی۔ عذرا HOW GREEN

WAS MY VALLY کی قسم کا ناول ہے یہ عہد گذشتہ کی یاد دلاتا ہے یہ ایک ایسے زمانہ کی یاد دلاتا ہے جو کہ اب ختم ہو چکا لیکن جس کے سلوک اور شرافت کی یاد اب بھی فرحت بخش ہے۔

نقش اوّل: ان قصّوں کا تعلق زیادہ تر ہماری تہذیب و معاشرت اور گھریلو زندگی سے ہے انسان کی زندگی ایسے بہت سے واقعات اور حالات سے بھری پڑی ہے جن میں قصّوں اور افسانوں کے لیے کافی سامان موجود ہے۔ نظر اور تخیّل شرط ہے۔ اور اس کے ساتھ بیان کا سلیقہ بیگم عابد حسین میں یہ تینوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ ان قصّوں کی زبان اور بیان سادہ اور دل کش ہے۔ کہیں کہیں ظرافت کی چاشنی بھی ہے۔ بعض قصّے بہت پُر لطف ہیں جیسے "آنکھ کا ڈاکٹر" اور "شادی" وغیرہ اور بعض بہت پُر درد جیسے "ایک پیسا"، "تارہ" وغیرہ ان قصّوں میں بعض جگہ ہماری پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر بھی ہو جاتی ہے اور ان کا تقابل بڑا لطف دیتا ہے

(ڈاکٹر عبدالحق صاحب)

نقشِ اوّل کے سب ڈرامے اسی طرح کے ہیں۔ ہنستی کھیلتی زندگی، سچی سیدھی زندگی جس میں مرد عورتیں چھوٹے بڑے اپنی فکروں میں۔ اپنے غموں میں اور اپنی کش مکش میں۔ کبھی اپنے آپ اور کبھی دوسروں کے سہارے سے تبسّم کا سامان تلاش کر لیتے ہیں۔ افسانے بھی زندگی کی تصویریں ہیں ..... درد بھری زندگی کی ..... آنسوؤں کی زندگی کی ..... ان میں دلوں کی نفسیات بھی ہے اور آس پاس کی زندگی کی جزئیات بھی .... نقشِ اوّل کے افسانے ادبی خلوص سادگی بیان اور افسانوی دل کشی کی بڑی اچھی مثالیں ہیں۔ "ایک پیسا"، "تارہ" اور "خوابِ آرزو" تو خصوصاً ایسے افسانے ہیں جنھیں اُردو کے افسانوی ادب کی صفِ اوّل میں رکھا جا سکتا ہے۔

(سیّد وقار عظیم صاحب)

راہِ عمل: صالحہ عابد حسین کا چوتھا ناول راہِ عمل مکتبہ جامعہ نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ ان کے سماجی شعور میں نیا ہندستان اور اس کے مسائل اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ وہ اپنے افسانوں، ناولوں اور مقالوں میں انھیں کسی نہ کسی پہلو سے ضرور جگہ دیتی ہیں چنانچہ یہ ناول اس کی ایک واضح مثال ہے۔ اس کا موضوع آزادی کے بعد کا ہندستان،

اس کے دیہات اور تعمیری کام کرنے والے پُرجوش کارکن ہیں جن کی انفرادی اور سماجی زندگی کی کش مکش سے ناول کا پلاٹ ترتیب پاتا ہے۔ کوئی ادبی کارنامہ کس حد تک مقصدی اور تعلیمی ہو سکتا ہے، یہ بحث بہت پرانی ہی نہیں غیر مختتم بھی معلوم ہوتی ہے تاہم اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اس کو کامیابی کے ساتھ نبھانے کا دار و مدار فنکار کی سوجھ بوجھ، مقصد سے جذباتی اور ذہنی وابستگی، قوتِ مشاہدہ اور ادبی صلاحیت پر ہوتا ہے۔ کسی فن پارے میں مقصد کا جگہ پانا معیوب نہیں، کامیابی سے پیش نہ کرنا معیوب ہے۔ اس ناول میں ناول نگار کو اس کش مکش کا سامنا مستقل رہا ہے کہ وہ کہانی کی فنی ضرورتوں اور مقصد میں کس طرح توازن قائم رکھے۔ اس لیے کہیں کہیں ہلکی پھلکی جذباتیت اور رومانیت سے کام لیا گیا ہے۔

ناول کا قصہ بنیادی طور سے آزاد ہندستان کے ایک گاؤں کملا نگر کی سماجی اور معاشی تعمیر پر مبنی ہے اور کہانی کا عمل زیادہ تر وہیں رونما ہوتا ہے لیکن دو بڑے شہر سکندر پور اور بمبئی بھی کرداروں کی تگ و دو کے مرکز بن جاتے ہیں۔ اس طرح دیہاتی زندگی کی سادگی اور صنعتی زندگی کی گہما گہمی کا تقابل بھی پیش نظر ہو جاتا ہے۔ کملا نگر میں کچھ قدیم خیالات کے ہندو، مسلمان، زمیندار اور کسان آباد ہیں، وہاں کے ایک ہوش مند، تعلیم یافتہ اور قومی خدمت کے جذبہ سے معمور سیاسی کارکن اور رہنما حبیب میاں کو اس گاؤں کی ترقی کا خیال آتا ہے اور وہ اس کا ایک نقشا تیار کر کے حکومت سے امداد بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ وہاں تعلیم و تربیت کے نئے مرکز قائم ہو جاتے ہیں اور گیتا رجو اصلاً وہیں کی رہنے والی ہے لیکن جس کی ذہنی تربیت حبیب میاں اور ان کی بیوی صفیہ بیگم کی زیر نگرانی ہوتی ہے اپنی گوناگوں صلاحیتوں کی وجہ سے اس تحریک کی روح رواں بن جاتی ہے۔ کچھ اور تعلیم یافتہ نوجوان جیسے انویم اور ندیم بھی اس کے شریک کار بن جاتے ہیں۔ ایک غیر تعلیم یافتہ قدیم طرز کے گاؤں میں ان کا ملا جلا خیر مقدم ہوتا ہے اور جیسا کہ فطری طور پر ہونا چاہیے تھا۔ کچھ لوگ خوش نظر آتے ہیں اور کچھ ناخوش۔ اس خوشی اور ناخوشی میں زر، زن اور زمین سب اپنا کھیل کھیلتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں کچھ نوجوان اور پسماندہ لوگ تعمیر کے نئے جذبے سے معمور ہو جاتے ہیں وہاں کچھ بوڑھے مفاد پرست ایسی ہر کوشش میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ نہ میں محبت کی فطری کشش کا کھیل بھی خاموشی سے جاری رہتا ہے۔ اس طرح ناول کے قصہ

میں پیچیدگی پیدا ہوتی جاتی ہے جس میں انفرادی خوشی اور کامیابی سماجی ایثار کے جذبے سے متصادم نظر آتی ہے۔

صالحہ عابد حسین نے اچھی خاصی مہارت سے کرداروں کو ان کے فطری تقاضوں کے ساتھ پیش کیا ہے اور گو وہ کسی وقت بھی اس سے غافل نہیں رہی ہیں کہ اپنے بنیادی مقصد میں ان سے کیا کام لینا ہے لیکن انھوں نے ہر کردار کو اس کا موقع دیا ہے کہ وہ اپنی انفرادی افتادِ طبع کے ساتھ کہانی کے پیچ در پیچ عمل میں داخل ہو۔ اسی وجہ سے سکینہ، خالدہ، صفیہ بیگم، انوپم اور ساجو کے کردار بڑی جاذبیت پیدا کر لیتے ہیں۔ گینا، جس سے یہ کہانی شروع ہوتی ہے پوری طرح مطمئن نہیں کرتی کیوں کہ بمبئی میں اس کی زندگی کے نشیب و فراز غیر ضروری طوالت اختیار کر لیتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنّفہ نے کہانی میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ان حالات کو اتنا پھیلا دیا ہے۔ اس کے منگیتر کا ذکر کئی بار آکر اس وقت غائب ہو جاتا ہے جب وہ بمبئی میں دستیاب بھی ہو جاتا ہے۔ مجموعی طور سے یہ ناول اپنے مقصد میں کامیاب ہے بس کہیں، کہیں پر واقعات کی تفصیل بے مزہ ہو گئی ہے کیوں کہ وہاں آمد کے بجائے آورد کا احساس ہونے لگتا ہے۔ میرے خیال میں یہ ناول بہت زیادہ واضح طور پر مقصدی ہونے کے باوجود دلچسپ ہے۔ اس کا راز ناول نگار کے خلوص اور اندازِ بیان میں پوشیدہ ہے۔

(سید احتشام حسین)

راہِ عمل: راہِ عمل، بیگم صالحہ عابد حسین کا ناول ہے۔ ان کا پہلا ناول ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اب تک ان کے تین ناول اور افسانوں کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں اس لیے وہ اس میدان میں نو وارد نہیں ہیں اور اُن کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے انھوں نے جس ماحول میں ہوش کی آنکھ کھولی ہے اس پر مولانا حالی مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کا بہت گہرا اثر ہے۔ جو اقدار ہمیں مولانا حالی، مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے یہاں ملتی ہیں، وہی راہ عمل میں مصنّفہ کے پیشِ نظر رہی ہیں کملانگر کی چھوٹی سی بستی میں بیداری کی لہر دوڑانے میں حبیب میاں، گینا، انوپم اور ندیم پیش پیش ہیں۔ ندیم جوشیلا ہے۔ اس کی اپنی شخصیت ہے۔ رائے ہے، اپنا سوچا سمجھا طرزِ عمل ہے وہ عدم تشدد کا مخالف اور بائیں بازو کا ہم درد ہے۔ انوپم سادہ

مزاج پُر خلوص اور انتھک کام کرنے والا ہے۔ اس کے دل میں قوم کا سچا درد۔ اس کی بھلائی کی لگن اور اس کی سیوا کا گہرا جذبہ ہے۔ ویسے یہ دونوں خدمت کو سب سے بڑی سعادت سمجھتے ہیں اور ان کا آدرش یہ ہے کہ ہندستان کی ہر عورت کو سچی اور پوری آزادی حاصل ہو۔ ان میں علم کی روشنی پھیلے اور عمل کی تعمیری صلاحیتیں بیدار ہوں۔ انوپم کا خاص مقصد گاندھی جی کے اصولوں کی تبلیغ ہے۔ جس میں محبت، سچائی، عدم تشدّد اور امن پسندی کو سب سے بڑا درجہ حاصل ہے۔ انوپم سوشل سروس کا انچارج ہے۔ اس کے دل میں خدمت کا گہرا جذبہ ہے اس میں انتھک محنت کی ایسی قوت اور لوگوں کو پرچانے کی ایسی مقناطیسی طاقت ہے جو ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے۔ سیوا اور پریم کی آگ جو اس کے دل میں ہے وہ اس کی چنگاری، دوسروں کے دلوں میں بھی ڈال سکتا ہے۔ اس ناول میں گیتا اور خالدہ اور ندیم کی دوستی گنگ وجمن کے ملاپ سے زیادہ خوبصورت اور ہماری متحدہ کلچر کی بلیغ علامت ہے اس طرح حبیب میاں بہترین تہذیبی روایات کے آئینہ دار ہیں اور گیتا ہندستانی عورتوں کے لیے بہترین مثال ہے۔

صالحہ عابد حسین نے کملا نگر کی فضا کو خوب پیش کیا ہے۔ گاؤں کے لوگوں میں سیکھنے کی لگن، جاننے کا شوق، اپنے کو پہچاننے کا جذبہ گاؤں والوں کے اکھڑ انداز میں خلوص اور اپنائیت، گیتا اور خالدہ کی محبت وخدمت۔ ندیم اور انوپم کی کوشش یہ کملا نگر ایک آیڈیل بستی بن جائے۔ گاؤں والوں کی نادانی اور جہالت۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسان دوستی ہمدردی، سیوا کی لگن، علم کی پیاس، کچھ کرنے اور کچھ بننے کی آرزو۔ کملا نگر میں قدیم اور جدید کی کش مکش، مرتے ہوئے زمین دارانہ خیالات اور اُبھرے ہوئے ہندستانی جمہوریہ کی جھلک، ان سب چیزوں کو صالحہ عابد حسین نے مصوّرانہ چابک دستی سے پیش کیا ہے۔

اُردو کے ناولوں میں عام طور پر گہرائی اور توازن بہت کم ہے۔ سرشار کے یہاں قصّہ ہی سب کچھ ہے، نصیحت کچھ نہیں۔ نذیر احمد کے یہاں نصیحت ہی سب ہے۔ اور قصّہ برائے نام ہے، پریم چند صراطِ مستقیم کے قائل ہیں۔ زندگی کے پیچ وخم سے آشنا نہیں، بعض ناول نگار بعض ہنگامی واقعات ہی سے سروکار رکھتے ہیں لاشعور اور باطن کی ہنگامہ آرائیوں سے واسطہ نہیں رکھتے۔

صالحہ عابد حسین کے یہاں بھی گہرائی اور توازن کم ہے۔ وہ ناول کے ارتقا اس کے نشیب و فراز اور اس کی موجودہ منزل سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔ انھوں نے باطن میں اُترنے اور لاشعور کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی محبت میں وہ گرمی نہیں ہے جو مرد و عورت کے فطری میلانات کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس پر روحانیت اور تقدّس کا سایہ ہے مولوی نذیر احمد کی طرح ان کے بیان میں بھی واعظانہ خشکی اور ایک سرد قسم کی مقصدیت ہے۔ وہ ان اصلاحی خیالات سے جو آج کل بار بار پیش کیے جاتے ہیں اس درجہ متاثر ہیں کہ اُن کی فنکارانہ حیثیت مجروح ہوگئی ہے۔ ناول لکھنے کے لیے زندگی کے گہرے عرفان اور سنجیدہ و مہذب شعور کی ضرورت ہے وہ دراصل ایک فلسفیانہ مشغلہ ہے اور ایک اچھے ناول نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ قدروں کی کش مکش، کردار کی خصوصیات، انسانی جذبات کے اُتار چڑھاو باہمی تعلقات کی پیچیدگیوں اور نفس انسانی کی گتھیوں کو اس سلیقے سے پیش کرے کہ وہ ادبی یا شاعرانہ حقیقت معلوم ہوں۔ صالحہ عابد حسین کا یہ ناول "راہ عمل" فنی اعتبار سے کمزور ہے لیکن اس میں معنویت ہے۔ ان کے قصّے میں قصہ پن کم اور اس کا فنی آہنگ مدھم ہے لیکن اسی میں ایک نقطۂ نظر ہے جس کو پورے خلوص سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کی کردار نگاری میں تجربہ کی گہرائی اور ارتقا کے اصولوں کی کارفرمائی زیادہ نہیں ہے۔ انھوں نے ارتقا کی منزلیں خط مستقیم کے ذریعے ظاہر کی ہیں لہروں کے ذریعے نہیں۔ تاہم یہ عجیب بات ہے کہ ان کا ناول بے کیف اور بے لطف نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صالحہ عابد حسین زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ مکالموں کی برجستگی اور طرز ادا کی خوبی نے ان کو واعظ اور ناصح ہونے سے بچا لیا اور ان کو موجودہ اُردو ادب کی ایک نام ور شہزادی بنادیا۔

(پروفیسر خواجہ احمد فاروقی)

"قطرہ سے گہر ہونے تک" ہمارے سماج کی ایک کامیاب تصویر ہے۔ اس ناول میں نہ کوئی ماورائی مضمون ہے، نہ بیمار دماغوں کی کش مکش ہے، نہ بیماری کے مشغلوں کی روداد ہے۔ بلکہ یہ ایک چھوٹے سے خاندان کی روزمرّہ زندگی کا ایک ایسا نقشا ہے جس میں ذہنی عمل سے زیادہ خارجی عمل، اور نفسیات سے زیادہ باہمی تعلقات پر نظر رکھی گئی ہے۔ اس میں اعلا مسائل کے ساتھ نبرد آزمائی سے زیادہ چھوٹی

چھوٹی خوشیوں کی تلاش پر زور ہے۔ خاندانی ذمہ داریوں کا پورا کرنے کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ فطری غموں کو برداشت کرنے کا حوصلہ اور اس وسیع دنیا میں اک پرسکون زندگی گزارنے کی خواہش، اس کا اصل موضوع ہے۔ جس کی تکمیل کے عمل میں، قصبوں اور شہروں کی زندگی، پرانے خاندانوں کی خستہ حالی، نوجوانوں کے اچھے اور برُے منصوبے، بڑی بوڑھیوں کی تنگ نظری یا وسعت قلب، لڑکیوں کے مذاق اور میلانات کا اک ایسا تانا بانا بنا گیا ہے جو ہماری سماجی زندگی کو بحیثیت مجموعی سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اور ناول کے دائرہ میں متنوع اور منفرد کرداروں کو جنم دینے اور انھیں فطری انداز سے آگے بڑھانے میں زمین کا کام کرتا ہے۔ انیس اقبال اس زمین کا محور ہیں۔ جن کے گرد کئی چھوٹے چھوٹے سیارے گردش کرتے نظر آتے ہیں۔ کلثوم بیگم اور ان کا گھرانا، سلمان کا خاندان، اقبال حسین کے بھائی بہن۔ اوشا اور رمیش یہ سب کے سب انھیں کی بدولت ایک رشتہ میں منسلک ہیں۔ ان میں عابد علی اور مامی بی، قدیم کے بہترین ترجمان ہیں رسلمان اور اوشا جدید کے۔ انیس اور اقبال ایک بلند تر سطح پر، قدیم و جدید، اور مشرق و مغرب کے صالح اور بامعنی توازن کی نمایندگی کرتے ہیں۔ اور ناول کے آخر میں کرداروں میں کلثوم بیگم کا کردار، ایسی حیرت انگیز بے لوثی کے ہیں ان کا سفر یورپ ایک بلیغ اشارہ کا حکم رکھتا ہے۔ ناول کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ شاید ہی اردو زبان میں کہیں اس سے پہلے کوئی ایسا کردار نظر آئے۔ ان کے روزمرہ اعمال اور انسانی تعلقات کے محرکات، ہر موقع پر الفاظ کی مدد کے بغیر، نظر آجاتے ہیں۔ پوری شخصیت مربوط اور منظم ہے۔ اس کے اندر چند اصول کارفرما ہیں، اور اس لیے ان کی پیچیدہ سیرت کے مختلف پہلوؤں میں کہیں تضاد دکھائی نہیں دیتا۔ ان کی جسمانی ناآسودگی، انتقامی احساسات، حکمرانی کی زبردست خواہش، کام و دہن کی لذتوں کے تعاقب، ہنگامہ آرائی، مصلحت پسندی، خود فریبی، ٹھیٹھ دنیاداری اور رسمی دینداری میں بڑا گہرا تعلق ہے۔

باقی کردار بھی زندہ اور فطری ہیں۔ اور ان کی مصوری میں بیگم صالحہ عابد حسین نے نفسیات سے گہری واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ ان میں سب سے کامیاب کردار غزالہ، اوشا، سلمان سیما اور ظفر ہیں۔

انیس اور اقبال اس ناول میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک طور سے مثالی کردار ہیں۔ وہ ان تمام اخلاقی سیاسی اور مذہبی قدروں کی نمایندگی کرتے ہیں جو مصنفہ کے نزدیک زندگی کا اور انسانیت کا لنگر ہیں۔ انھیں علم سے محبت ہے۔ مگر باعمل ہیں خوش مذاق ہیں۔ اور دنیا کی راحتوں کو عزیز رکھتے ہیں۔ مگر دوسروں کی ضروریات کو اپنی راحتوں پر مقدم رکھتے ہیں۔ اور جہاں دیس کا سوال ہو، وہاں اپنی ساری خواہشات کو تج دینے میں بھی تامل نہیں کرتے۔

اقبال حسین، عالم ہیں۔ لیکن نہ وہ کوئی منصب چاہتے ہیں۔ نہ دولت کی ہوس رکھتے ہیں۔ سادہ زندگی گزارتے ہیں۔ اور نوجوانوں کی ذہنی ترقی اور خوش حالی میں اس طور سے کوشاں رہتے ہیں گویا خود ان کی نجات کا راستہ یہی ہے۔ ضبط اور خوش دلی ان کی سیرت کا جوہر ہیں۔ جہاں جاتے ہیں جان محفل بن جاتے ہیں۔ لیکن بھری محفل میں، تنہا نظر آتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی دردمندی ہے۔ جسے عقل اور علم کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ جو خود عقل اور علم کا سہارا ہے۔ انیس کا کردار ان کے مقابلے میں زیادہ دلچسپ اور جاذِب نظر ہے۔ وہ عورت ہے لیکن مردوں کا سا حوصلہ رکھتی ہے۔ اس میں ایک قسم کا احساس برتری ہے لیکن اس کے ہر عمل میں شفقت مادری کی آنچ محسوس ہوتی ہے۔ وہ نوجوانوں کے احساسات کو سمجھتی اور سمجھ کر، ان کا پورا پورا ساتھ دیتی ہے۔ اس میں بزرگی کا رس ہے لیکن وہ عمر کے لحاظ سے جتنی بڑی نہیں ہے۔ اس سے زیادہ اپنے آپ کو ثابت کرتی ہے۔ اس میں اس کی تربیت شادی اور مسلسل قربانیوں کا ہاتھ ہے۔ وہ چند خوشیوں سے محروم ہے۔ لیکن وہ اپنی محرومی کو دوستوں کی خاطر بھولے رہتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کی جان نثار اپنے خاندان کی پالن ہار، حریف؛ ظریف اور غم گسار ہے۔ بوڑھے باپ کے ظلم کو بڑی جلدی بھول جاتی ہے۔ سوتیلی ماں کی کمزوریوں کو جانتی ہے مگر اس کے حال اور مستقبل کے خیال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ دوستوں کے ہر تجربہ میں ان کی شریک ہے۔ اور ان اوصاف کی بنا پر اقبال حسین کے کردار کی تکمیل کرتی ہے۔

زبان کی صحت اور شگفتگی کے لحاظ سے اور خاص طور سے مکالموں کے مطابق حال انداز اور بے ساختگی کے اعتبار سے اردو زبان میں یہ ناول ایک نمایاں

حیثیت رکھتا ہے۔

(ڈاکٹر خورشید احمد)

"یادوں کے چراغ" اردو ناول کی صنف میں ایک اچھا اضافہ ہے اور مصنفہ کی اب تک کی تصانیف میں شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ اس میں مرکزی کردار کنول احمر کا ہے اور ناول کا عمل پورے چالیس سال پر پھیلا ہوا ہے یعنی کنول احمر کے بچپن اور موت تک کے درمیان جو وقفہ ہے اسی کے گرد ناول کا تانا بانا بنایا گیا ہے۔ تصویر کو پوری طرح ابھارنے کے لیے اس خاندانی ماحول کا نشیب و فراز اور اس کی گتھیاں بھی دکھائی گئی ہیں۔ جن میں کنول پلی بڑھی ہے۔ کہانی بیان کرنے والی خود کنول ہے جو گویا وقت کے ایک نقطہ پر کھڑی ہوئی ماضی کے ان گنت لمحوں کا جائزہ لے رہی ہے۔ اور اس اعتبار سے کہانی کا عنوان بہت مناسب ہے۔ یہ خاندان جس میں کنول نے پرورش پائی ہے متوسط قسم کا ایک ہندستانی گھرانا ہے اور وہ جس معاشی اور تہذیبی بحران سے گزر رہا ہے اس نے لازمی طور پر کنول کی نفسیات کے خطوط کو متعین کیا ہے۔ کنول کا شوہر احمر گویا کنول کی ضد ہے۔ ان دونوں کی زندگی میں جو کشمکش، شخصیت اور ماحول کے تضاد کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے، وہی اس ناول کے المیہ کی کلید ہے۔ کنول ایک مثالی کردار ہے جس میں مصنفہ نے ان تمام اقدار کو سمو دیا ہے جن میں وہ خود یقین رکھتی ہیں۔ اس کردار پر گہری چھاپ اسی کے ماموں سجاد مہدی کی ہے۔ سجاد مہدی اور ان کی بیوی کے درمیان جو مکمل ہم آہنگی اور ایک دوسرے کا عرفان ہے، وہ گویا کنول اور احمر کے درمیان مطابقت کے فقدان نمایاں کر دیتا ہے۔ کنول کی زندگی مسلسل جد و جہد، ایثار، تہذیب نفس، شر کا مقابلہ کرنے کے لیے خیر میں یقین کو تازہ کرتے رہنے اور حق، محبت اور خدمت کے مقابلہ میں ہر طرح کی آسایش، ترغیب، تحریص کو پس پشت ڈال دینے کی داستان ہے۔ ناول میں مصنفہ نے اخلاقی اور روحانی اقدار پر زور دینے کے ساتھ ہی زندگی کی تلخ حقیقتوں سے آنکھیں چار کرنے کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ اور اسی طرح یہ اس ناول کی ایک حد تک حقیقت نگاری ان کے پچھلے کارناموں پر ایک اضافہ ہے۔ ناول کے پس منظر میں بدلتے ہوئے ہندستان اور اس کے مسائل کی بھی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ناول کے آغاز و انجام کا رشتہ ایک دوسرے سے جس طرح جوڑا گیا ہے اس سے فنی انصرام اور عمل کے

دروبست پر گرفت کا پتا چلتا ہے کہی جگہ انسانی عمل کے زیر و بم کو فطرت کے آئینہ میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش بھی نظر آتی ہے ضمنی کرداروں میں بھی ہمیں ہر طرح کے مرد عورتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اور وہ انسانی فطرت کے کسی نہ کسی گوشے کو بے نقاب کرتے ہیں، لیکن یہ سب کردار ایک بندھی ٹکی راہ پر چلتے نظر آتے ہیں۔ اور ان کی شخصیتوں میں جو امکانات پوشیدہ ہیں ان سے پوری طرح کام نہیں لیا گیا ہے۔ اسی لیے وہ ہمیں جھنجھوڑتے یا چونکاتے ہیں۔ ان میں کوئی کردار ایسا نہیں جس سے ہم اپنے آپ کو ہم آہنگ بھی کرنا چاہیں اور وہ ہمیں ایک معمّا بھی نظر آئے!

اپنی اپنی صلیب: (رشید احمد صدیقی)

صالحہ عابد حسین متوسط طبقے کی گھریلو معاشرت اور زندگی کے المیے کو جیسا وہ انسان کا، اور خصوصاً عورت کا مقدر ہے، پیش کرنے میں امتیاز رکھتی ہیں۔ "اپنی اپنی صلیب" کا موضوع بھی زندگی کا یہی درد اور کرب ہے جس کی آگ میں کہیں تو وجود جل کر بھسم ہو جاتا ہے، اور کہیں اندر ہی اندر سلگتا رہتا ہے۔ نیز یہ کہ دکھ کی نوعیت انفرادی ہے۔ دوسرے لاکھ ہمدردی کریں، انسان کو اپنا دکھ خود ہی سہنا پڑتا ہے، یعنی سب کو اپنی اپنی "صلیب" خود ہی اٹھانی پڑتی ہے، اور اس میں کوئی کسی کی جگہ نہیں لے سکتا۔

ناول میں تین باتیں خاص ہیں۔ اوّل یہ کہ اس میں عام ناولوں کی طرح واقعات تاریخی ترتیب سے بیان نہیں ہیں۔ ناول علی اصغر کی علالت شروع ہوتا ہے، اور ان کی موت پر ختم ہو جاتا ہے، اور اس چند مہینے کے وقفے میں پوری ایک زندگی بلکہ پورے ایک خاندان کی بھرپور زندگی کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ مصنفہ نے جگہ جگہ FLASHBACK سے کام لیا ہے، اور شعور کے بہاو STREAM OF CONSCIOUSNESS کی مدد سے کڑی سے کڑی ملاتی چلی گئی ہے۔ یہ تکنیک خاصی مشکل ہے، لیکن مصنفہ نے اسے بڑی خوبی سے نبھایا ہے۔ دوسرے یہ کہ مصنفہ کے پہلے ناولوں میں جزئیات نگاری اور تفصیل پرستی کا جو رجحان ملتا ہے، زیر نظر ناول میں اس پر قابو پانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ FLASHBACK کی وجہ سے کہیں کہیں تکرار راہ پا گئی ہے، اور تفصیل کو بعض جگہ کم کیا جا سکتا تھا۔ تاہم یہ حقیقت

ہے کہ مصنفہ غیر ضروری جزئیات نگاری سے بچنے میں بڑی حد تک کامیاب رہی ہیں۔ تیسری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ ناول واقعاتی نہیں، کرداروں کا ناول ہے۔ اس میں یادیں، واقعات، مکالمے سب کرداروں کی تکمیل کے لیے آئے ہیں، یا مرکزی خیال کی توضیح اور توسیع کے لیے۔

ناول کے بنیادی کردار چار ہیں، ایک مرد کا اور تین عورتوں کے۔ مرد کی حیثیت سورج کی ہے، اور عورتوں کی ثوابت و سیّارگاں کی۔ یہ چاروں کردار اتنے جاندار، اتنے سچے اور جذبات اور زندگی کی سچائیوں سے اس قدر نکھرتے ہوئے ہیں کہ ان کی تخلیق پر مصنّفہ کو جتنی مبارک باد دی جائے کم ہے۔ ان کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ان کی تعمیر کاری DELINEATION کے لیے مصنّفہ نے نہ تو کسی بڑی ڈرامائی حالت DRAMATIC SITUATION کا سہارا لیا ہے، اور نہ نظریاتی بحثوں کا نہ جنس، تشدّد یا تحیّر SUSPENCE کا، جو فکشن کی دنیا میں آج کے ادیب کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ صالحہ عابد حسین کے ہاں ڈرامائیت اور تحیّر صرف اتنا ہے، جتنا روزمرّہ کی زندگی میں ملتا ہے۔ اس کے باوجود وہ بنیادی انسانی قدروں یعنی انسانیت، شرافت، محبّت، خدمت اور قربانی وایثار کی شمع روشن کرنے اور ان کی مدد سے دردمندی کی ایسی فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئی ہیں جس میں قاری کرداروں کے ساتھ ہو جاتا ہے، اور کرداروں کے دل کی دھڑکن قاری کے دل کی دھڑکن بھی جاتی ہے۔ یہاں ان کرداروں کے تفصیلی تجزیہ کی گنجایش نہیں، البتہ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ علی اصغر اور ان کی بہن زہرا دونوں مثبت کردار ہیں — نرم دل، خلیق و وضیع دوسروں پر جان نثار کرنے والے، محبّت، شفقت اور خلوص کے پتلے، اور سیرت اور اخلاق کی خوبیوں سے ہیرے کی طرح دمکتے ہوئے۔ ان کے مقابلے میں علی اصغر کی بیوی رضوانہ منفی کردار ہے، بدمزاج اور چڑچڑی، جس کی میاں سے کبھی نہ بنی۔ خالہ زاد بہن حمرا اگرچہ مثبت کردار ہے، جو علی اصغر کی یاد کو دل سے بھلا کر اپنی زندگی مقصود کی خدمت میں کھپا دیتی ہے، لیکن حمرا کی قربانی اور ایثار کی سطح وہ نہیں جو زہرا کی ہے۔ یہاں ایک بات غور طلب ہے۔ ناول کے ہیرو علی اصغر ہیں اور اس کی ہیروئن ان کی بہن زہرا۔ مصنّفہ نے جس اعلا انسانی اقدار یعنی درد و کرب میں ضبط و صبر اور جذبۂ محبّت کے نفوذ اور ترفّع کے لیے علی اصغر اور زہرا کی تخلیق کی ہے، یہ کردار

بلا شبہ ان اقدار کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں، لیکن اس کے باوصف یہ کردار ابھرے ہیں۔ زہرا کے ہاں پھر بھی سچی کش مکش ہے، اور زندگی کے نبرد آزمائی کا حوصلہ بھی ملتا ہے۔ لیکن علی اصغر خاصے بے نیاز انسان ہیں جن کا ماں اور بہنوں سے محبت کا جذبہ تو راسخ ہے، لیکن زندگی کرنے کا عزم کھل کر ظاہر نہیں ہوتا۔ ان کے ایک ملازمت کے جاتے رہنے کے بعد دوسری ملازمت نہ کر سکنے اور اس کے بعد بزنس میں ناکام ہونے سے جو تصویر ابھرتا ہے، وہ ایک ایسے مثالیت پسند IDEALIST انسان کا ہے جس میں عمل کی قوتیں خاصی کمزور ہیں۔ اپنی بیوی کی بدمزاجی کے خلاف ان کا ردعمل سوائے خاموشی کے کیا تھا۔ یا اسے بدلنے کی انھوں نے کیا کوشش کی؟ ان کی شخصیت کا روشن ترین پہلو زہرہ اور حمرا سے ان کا گہرا لگاؤ ہے۔ بہن کی محبت، بڑی چیز ہے، لیکن زندگی سے بڑی نہیں۔ بچارے علی اصغر فرشتہ پیدا ہوئے، اور فرشتہ مرے۔ علی اصغر اور زہرہ دونوں کے کرداروں کے مقابلے میں فنی اعتبار سے کہیں زیادہ مکمل کردار رضوانہ کا ہے۔ اس کردار میں ارتقا کی شان بھی ہے، گہری کش مکش بھی، اور یہ ڈرامائی تطہیر باطن CATHARSIS کے عمل سے بھی گزرتا ہے۔ رضوانہ کی بدمزاجی اس کی اپنی ہے، لیکن ازدواجی زندگی کی ناکامی میں اس کے ماں باپ کے لاڈ پیار کا بھی ہاتھ ہے، اور اس کے شوہر کے اپنی ماں اور بہنوں سے شدید جذباتی لگاؤ کا بھی۔ شوہر کی طبیعت کے زیادہ خراب ہونے کی اطلاع ملنے پر (بادل ناخواستہ ہی سہی) وہ راتوں رات شہر سے گاؤں پہنچتی ہے، راہ میں شوہر کی موت کے تصور سے اس کے دل کا بھر بھر آنا، پوری زندگی کے دکھوں اور شدائد کو یاد کر کر کے اس کا باطنی تبدیلی کے عمل سے گزرنا، اسے ایک ایسا انسان ثابت کرتے ہیں جسے زندگی کی سچائیوں کا گہرا احساس ہو گیا تھا۔ اثر انگیزی کے اعتبار سے یہ باب ناول کا نقطۂ عروج CLIMAX ہے۔ ناول کا انجام علی اصغر کی موت نہیں، بلکہ انجام کی پرچھائیں تو وہیں سے پڑنا شروع ہو جاتی ہے، جب علی اصغر اپنی خالہ اور ماں کی نشانی، اپنی عزیز ترین انگوٹھی حمرا کو پہناتے ہیں، یہ ایک طرح سے مرد اور عورت کے درمیان اس ازلی اور ابدی رشتہ کی علامت ہے جو حالات کی مجبوریوں کی وجہ سے مترفع SUBLIMATE ہو جاتا ہے۔

ناول کے آخر میں علی اصغر کے انتقال کے بعد زہرا اور حمرا دونوں ایک دوسرے

کو سہارا دیتی ہیں کہ زندگی کے غم بوجھ نہیں جو بانٹ لیے جائیں۔

"حمرا بھیا نے کہا تھا:

'EVERYONE HAS TO BEAR HIS OWN CROSS'

کتنی سچی بات! ہر ایک کو اپنی اپنی صلیب خود ہی اٹھانی پڑتی ہے!"

"ہاں باجی — بھیا تو اپنی صلیب اٹھائے منزل تک پہنچ گئے۔۔۔"

"آہ کتنی بھاری تھی ان کی صلیب!"

"ہاں باجی — وہ تو منزل پر آرام کر رہے ہیں — اور ہم — ہم —"

"مگر ہم ابھی اپنی اپنی صلیب اٹھائے چل رہے ہیں بھنو!" زہرا نے کھوئے لہجہ میں کہا۔

"اور ابھی جانے کب تک چلنا ہے۔ کتنی دور ہے ہماری منزل باجی —؟"

رضوانہ کی صلیب بھی اتنی ہی بھاری تھی، اور جانے اس کی منزل بھی کتنی دور تھی! خوشی سب انسان ایک سی چاہتے ہیں، لیکن دکھ سب کے الگ الگ ہیں، اور ہر انسان کو خود اپنے دکھوں کے ساتھ جینا اور خود اپنے دکھوں کے ساتھ مرنا پڑتا ہے۔ اس بنیادی حقیقت کا احساس پورے ناول میں ایک زیریں موج کی طرح موجود ہے اپنی گہری دردمندی، اعلا انسانی اقدار کی پاسداری، اور زبان و بیان کی صفائی اور فنکارانہ مہارت کے اعتبار سے یہ ناول اردو کے ان ناولوں کے ساتھ جگہ پائے گا جو بار بار پڑھنے جائیں گے، اور یاد رکھے جائیں گے۔

(پروفیسر گوپی چند نارنگ)

گوری سوئے سیج پر:

صالحہ عابد حسین ناول نگاری کی دنیا میں نو وارد نہیں ہیں اس کے علاوہ اور ناول بھی تخلیق کر چکی ہیں۔ افسانے اور مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان اصناف ادب کے باہمی فرق کو سمجھتی ہیں۔ زیر نظر ناول سے ان کے تخلیقی کرب کا اندازہ ہوتا ہے اعتراف آرزو ہیں۔ اس کی اشاریت موجود ہے۔ ناول کے مرکزی کردار دو ہیں سہیل اور اس کی رفیقۂ حیات مہرو جس کا اصل نام ماہ رخ ہے۔ معنی دونوں کے ایک ہیں مگر مہرو شوہر کی عطا ہے۔ وہ اسی نام سے پکارتا ہے۔ بیوی شریک حیات کو سیاں کہتی ہے مہرو اور سیاں میں پیار کا رس گھلا ہوا ہے۔ معاون کرداروں میں سہیل کے دوست اختر علی اور ملازمین کے

علاوہ بہت سے گھریلو افراد شامل ہیں، بھائی بھاوج اور بیٹے بیٹیاں یہ سب ناول کی تعمیر میں اپنا رول ادا کرتے ہیں ــــ آغاز مہرو کی موت سے ہوتا ہے اس طرح ابتدا ہی انجام کی غماز ہے جس ناول کا انجام شروع ہی میں معلوم ہو جائے ان میں قاری کی دلچسپی باقی نہیں رہتی لیکن اس ناول پر یہ بات صادق نہیں آتی۔ مصنفہ کے سحر کار قلم نے اگلے ابواب میں داستان حیات اسی ڈھنگ سے قلم بند کی ہے کہ پڑھنے والے کی محویت بڑھتی جاتی ہے ناول تقریباً ڈھائی تین دن کا احاطہ کرتا ہے سارے سانحات اسی مختصر عرصہ میں وقوع پذیر ہوتے ہیں کہیں ڈائری کی مدد سے کہیں کرداروں کی زبان سے ان کا بیان ہوتا ہے۔ کرداروں کی نفسیات میں ہم آہنگی نہیں سب ہی اپنے مزاج کے آپ نمائندہ مصنفہ کا امتیاز یہ ہے کہ وہ ہر موڑ پر ان کے متضاد جذبات کی عکاسی فنکاری کے کے ساتھ کرتی ہیں رقابت، عشق و محبت یہاں تک کہ جنسی کیفیات کو بھی اس ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے کہ مریضانہ خواہشات میں ذرا جنبش نہیں ہوتی آگرہ کے سفر میں نسیم اور سہیل کی رنگ رلیوں میں جنس کی آگ بھڑکتی ہے۔ مگر بیگم صالحہ کا قلم جو ایک ہوشمند حسن کار کی انگلیوں کی گرفت میں ہے بے قابو نہیں ہوتا محتاط ہی رہتا ہے یہ احتیاط زاہدانہ نہیں فنکارانہ ہے۔ حسین اشاریت کے پردے میں مصنفہ اس نازک مرحلہ سے گزر جاتی ہیں۔ سہیل کی شادی ایسے عالم میں ہوئی جب وہ نسیم کی زلف گرہ گیر کا اسیر تھا یہاں اسے نسیم کی زبان میں بزدل اور بے وفا کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ کردار کا ایک پہلو ہے۔ بیگم صالحہ نے سہیل کے کردار پر سے بہت سے پردے ہٹائے ہیں ـ ان کے اندر سے نئے نئے گوشے ابھرے ہیں جو سہیل کو ایک رخا نہیں دس رخا بنا دیتے ہیں سہیل حجلۂ عروسی میں داخل ہوا ہے تو وہ نسیم کا پرستار تھا۔ ماہ رخ کے وجود میں اسے کشش محسوس نہیں ہو رہی تھی وہ اپنا عشقیہ افسانہ سنا کر نہ جانے کیا کہنے والا تھا کہ ایک طرف تو نسیم کی آواز لاشعور سے ابھری، تم اس کا دل نہیں توڑو گے اس کے جذبات کا خون نہیں کرو گے۔ اس کی دنیا نہیں اجاڑو گے ــــ سہیل نے کم عمر دلھن کا چہرہ دیکھ کر اسے بے نور چاند کہا۔ اس کے منہ سے یہ بات سن کر بے اختیار نکلا۔

سیّاں!

اسی لفظ نے ایک ہی پل میں سہیل کا دل تبدیل کر دیا۔ ناول کا یہ حصہ بڑے نازک دور سے گزرا ہے لمحات تیز گامی کے ساتھ منزل پر پہنچ گئے ایک بار اور سہیل

کے قدموں میں لغزش ہوئی، قریب تھا کہ وہ باپ کے نقش قدم پر چل پڑے جس کا ذکر مصنفہ کر چکی ہیں اس نے سہیل کی ماں کی موجودگی میں دوسری شادی کر لی تھی۔ مصنفہ نے پھر اسے سنبھالا، وہ صحیح راستہ پر آگیا۔ ناول میں اوّل سے آخر تک بیگم صالحہ کا قلم گردش کرتا رہتا ہے جس منظر کی تصویر کشی کرتی ہیں اس کا پورا خاکہ سامنے رکھ دیتی ہیں بیگماتی زبان اور اس زبان کے محاورے شبنم کی طرح ٹپکتے محسوس ہوتے ہیں صالحہ کہیں مذہب کی ترجمان ہیں کہیں معاشی، سماجی اور رومانی جذبات کی عکاس، ان کا قلم کردار کے محسوسات کی پیروی میں بدلتا رہتا ہے ساس اور بہو کی تصاویر بھی اصل رنگ میں نظر آتی ہیں اولاد جس کی رگوں میں ماں کا خون جگر گردش کر رہا ہے اس وقت ماں کے سرہانے آتی ہے جب وہ فانی کی زبان میں کہتی محسوس ہوتی ہے۔

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

یہ شعر بہو کے خیالات کی نہایت صحیح تصویر پیش کرتا ہے۔ سہیل کی ذات جس قدر عریاں ہوتی گئی ہے۔ اس کی دلکشی میں اضافہ ہوتا گیا ہے۔ اختر علی نہایت پاکیزہ اوصاف کا حامل ہے اس کے خصائل اس حقیقت کو واشگاف کرتے ہیں کہ دوست بھائی سے کم ہمدرد نہیں ہوتا۔ ناول میں گھریلو فضا ہے جس میں باہمی رشتوں کی کش مکش تلخی اور محبت سب کچھ ملتی۔ ذائقہ اور تاثر سب کا جداگانہ ہے۔ ایک بات بہت کھٹکتی ہے۔ نسیم بہت اہم کردار تھی اسے ویرانے میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ انصاف ہونا چاہیے تھا۔

سفرِ زندگی کے لیے سوز و ساز: (کوثر چاندپوری)

گذشتہ چند برسوں سے اردو میں سفرناموں پر شباب آیا ہوا ہے۔ پاکستان میں بطورِ خاص ابن انشا مرحوم، ممتاز مفتی، مستنصر حسین، منیر احمد شیخ، ذوالفقار احمد تابش، عطاالحق قاسمی، پروین عاطف، اسلم کمال، انتظار حسین، فخر زماں وغیرہ نے بڑے دلچسپ سفرنامے لکھے ہیں اور ہندستان سے اس میدان میں رام لعل جوگندر پال، ہرچرن چاولہ، گوپی چند نارنگ وغیرہ نے اپنی سیاحتوں کی روداد قلم بند کر کے ادبی حلقوں کی دلبستگی کا سامان فراہم کیا ہے۔ اردو کی معروف ناول نویس اور افسانہ نگار بیگم صالحہ عابد حسین کی تازہ ترین تصنیف "سفرِ زندگی کے لیے سوز و ساز" اس صنفِ ادب میں ایک اور قابلِ ذکر اضافہ ہے۔ یہ

سفر نامہ دراصل موصوفہ کی خود نوشت سوانح عمری کا ایک حصہ تھا۔ جسے نظر ثانی کرتے ہوئے ایک علاحدہ کتاب کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ مصنفہ نے ہندستان کے مختلف علاقوں مثلاً کشمیر، حیدرآباد، بنگلور، میسور، بھوبلیشور، بھوپال وغیرہ کی سیاحت کے دوران جو مشاہدہ کیا اور جن تجربات سے گزریں ان کا تذکرہ بے حد ایجاز و اجمال کے ساتھ ابتدائی حصے "ہندستان جنت نشان" میں کیا گیا ہے لیکن خوبی یہ ہے کہ اس اختصار نے تصویروں کو دھندلا نہیں ہونے دیا۔ اپنے شوہر مرحوم ڈاکٹر عابد حسین کے ساتھ انھوں نے جرمنی کا جو سفر کیا تھا اس کا مفصل بیان "سفر ہے شرط مسافر نواز بہیترے" کے تحت ملتا ہے اسی سفر نامے میں انگلستان، پیرس، سوئٹزرلینڈ، اٹلی اور پاکستان کی سیاحت کے مختصر حالات بھی بیان کر دیے ہیں۔ کتاب کا آخری جزو سفر حج و زیارت سے متعلق ہے۔ اس طرح اس کتاب میں صالحہ عابد حسین کی اندرونی و بیرونِ ہند کی کم و بیش تمام سیاحتوں کے حالات یکجا ہو گئے ہیں۔ یاد پڑتا ہے کہ موصوفہ نے ۱۹۸۱ء میں پاکستان کا سفر نامہ بھی قلم بند کیا تھا لیکن جانے کیوں وہ دلچسپ رودادِ سفر اس کتاب میں شامل نہیں کی گئی ہے۔

ہمیں اردو میں کئی طرح کے سفر نامے مل جاتے ہیں۔ اس قسم کے روایتی سفر نامے بھی ہیں جن میں سیاح صرف جغرافیائی حالات بیان کر دینے کو کافی سمجھتا ہے جس میں بہت ہوا تو اس مقام کے آداب معاشرت وغیرہ بھی شامل کر دیے جاتے ہیں، دوسری قسم کے سفر ناموں میں عموماً صرف ملک کی تاریخ سے سروکار رکھا جاتا ہے۔ جس میں سنے سنائے قصوں کی شمولیت کی خاصی گنجایش ہوتی ہے ایک اور قسم سفر ناموں کی وہ ہے جس میں جھوٹی سچی مہمات شامل کرکے افسانوی رنگ ابھارا جاتا ہے۔ پیشِ نظر سفر نامے میں ان تینوں اسالیب سے چابک دستی کے ساتھ کام لیا ہے خوبی یہ ہے کہ اس کے آئینے میں نہ صرف سیاح کے خدوخال نظر آتے ہیں بلکہ جن ملکوں کی سیر کی گئی ہے وہاں کے نقوش اور اس جگہ کے باشندوں اور ہم سفروں کے کردار بھی جیتے جاگتے اور سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ مصنفہ درجنوں ناولوں اور افسانوی مجموعوں کی خالق ہیں اس لیے بیانیہ پر انھیں مکمل دسترس حاصل ہے۔ دبستانِ حالی سے متعلق ہونے کی بنا پر ان کی زبان بے حد رواں دواں اور سلیس ہے جس میں سادگی کے ساتھ پرکاری اور غیر آراستگی کے باوجود دلکشی ہے۔ میں اس کتاب کا ایک ایک حرف ناول اور افسانے جیسی دلچسپی کے ساتھ پڑھا ہے۔ مصنفہ کی انسان دوستی، خلوص مذہبی

رواداری اور وضعدار طبیعت کے نقوش ان کی تحریر میں جابجا روشن ہیں۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

(مظفر حنفی)

ممتاز ادیبہ :

سن اٹھاسی کے آغاز کے ساتھ ہی دنیائے اُردو سے ایک ایسی شخصیت بچھڑ گئی جس نے افسانہ، ناول، ڈراما، خاکہ نگاری اور ادب الاطفال کے فن کو خاصی تاب و توانائی عطا کی تھی۔ اس ہستی نے اپنی پیرانہ سالی کے باوجود بھارت میں اردو زبان وادب کی خدمت کو زندگی کا مشن بنائے رکھا۔ یہ معمّر و ممتاز ادیبہ صالحہ عابد حسین تھیں، جن کا پچھتّر سال کی عمر میں جامعہ نگر دہلی میں انتقال ہوگیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مرحومہ خانوادۂ حالیؔ کی ایک رکن تھیں۔ انھوں نے ۱۹۱۳ء میں پانی پت جیسے مردم خیز خطے میں آنکھیں کھولیں، موصوفہ نے ایک ایسے ماحول میں پرورش پائی جہاں علم وادب کا چرچا تھا، اسلامی تہذیب وتمدن کی رنگ آمیزی تھی اور صحابی رسول حضرت ایوب انصاری رضؓ کا ورثۂ عظیم باعثِ فخر وانبساط تھا۔ مرحومہ خواجہ غلام السیّدین جیسے ادیب کی ہمشیرہ تھیں، جو اقبال شناسی کے اوّلین افراد میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے مفکّر پاکستان کے متعلق ۱۹۲۶ء میں "اقبال ایجوکیشنل فلاسفی" کے عنوان سے انگریزی میں ایک جامع کتاب لکھی تھی جس کا مسوّدہ پڑھنے کے بعد حضرتِ علامہ نے انھیں ۲۱ر جون ۱۹۳۶ء کو لکھا تھا۔

"YOUR SUMMARY IS EXCELLENT AND I HAVE "NOTHING TO ADD"

اردو کے صفِ اوّل کے افسانہ نگار خواجہ احمد عبّاس مرحومہ کے کزن تھے۔ صالحہ صاحبہ کی شادی ممتاز ڈرامہ نگار اور ماہر تعلیم ڈاکٹر عابد حسین سے ہوئی تھی۔

خاندانی ماحول نے مرحومہ کے ادبی ذوق کو نمو بخشا تھا اور انھوں نے اہلِ خاندان کی طرح خود بھی قلم وقرطاس کو حرزِ جاں بنالیا تھا اور بچپنے سے بڑھاپے تک مسلسل اردو زبان وادب کی خدمت کرتی رہیں انھیں کہانی لکھنے کا فطری جذبہ ودیعت ہوا تھا۔ موصوفہ نے دہلی کے مسلمانوں کے متوسط طبقے کی تہذیب ومعاشرت کو فنکارانہ طور پر پیش کرنے اور قدیم مشرقی تہذیب پر جدید مغربی تعلیم کے اثرات کو اجاگر کرنے کی مخلصانہ کوشش کی تھی۔ انھیں اپنے افسانے "سنبھالا" سے ملک گیر شہرت حاصل ہوئی۔ اپنی زندگی میں وہ سیکڑوں اردو افسانے تخلیق کرچکی تھیں جو افسانہ نگاری کی تاریخ میں موضوع، اسلوب اور ہیئت کی بدولت ہمیشہ جگہ بنائے

رکھیں گے۔

مرحومہ اعلا پایے کی ناول نگار بھی تھیں مسلم معاشرہ اور اس کا تہذیب و تمدّن ان کا خاص موضوع تھا ان کے ناولوں میں سماجی شعور کے ساتھ اصلاحی رجحان کی کار فرمائی رہی ہے "عذرا" اور "آتش خاموش" ان کے مقبول ترین ناول شمار کیے جاتے ہیں۔ صنف ڈراما سے بھی مرحومہ کو دلچسپی تھی اور ان کے لکھے ہوئے متعدد ڈرامے اسٹیج بھی کیے گئے اور شائع بھی ہوئے۔ مضمون نگاری سے بھی انھیں خاص شغف تھا۔ اپنے جدّ امجد مولانا الطاف حسین حالی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر انھوں نے جو مضامین لکھے ہیں، وہ قدر و منزلت کے حامل ہیں۔

جامعہ ملّیہ میں رہائش پذیر ہونے کے ناتے موصوفہ بے شمار ادبی شخصیات سے متعارف ہوئیں جس کے نتیجے میں ان کے شخصی خاکوں کے دو مجموعے "جانے والوں کی یاد آتی ہے" اور "بزمِ دانشوراں" شائع ہوئے۔ بچّوں کے لیے انھوں نے درجن بھر سے زیادہ کتابیں لکھی تھیں جن میں کہانی ڈرامے اور ناول شامل ہیں۔ انھوں نے حالی پر نو عمر قارئین کے لیے تین کتابیں لکھیں اور بچّوں کے لیے مولانا کی لکھی ہوئی نظموں کا مجموعہ بھی مرتب کیا۔ موصوفہ کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں "غالب ایوارڈ" دیا گیا تھا۔

پچھتّر سالہ صالحہ عابد حسین فروغ اردو کے لیے بھارت میں جو خدمت انجام دے رہی تھیں ان میں صرف قلم کاری ہی نہ تھی بلکہ تہذیبی روایات کی پاسداری بھی تھی۔ گذشتہ سال موصوفہ نے راقم الحروف کو جو خط لکھا تھا اس سے ان کی "اردو دوستی" بخوبی عیاں ہوتی ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> "کاموں کا ہجوم ہے اور میری عمر اور صحت اب زیادہ دیر کام کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتی، پھر بھی خدا کے فضل سے کام ہوتا رہتا ہے آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ میری کوششوں اور خواہشوں پر پانی پت میں دسمبر ۱۹۸۵ء میں یوم حالی منایا گیا، سیمینار ہوا اور ہریانہ اردو اکیڈیمی کا قیام وجود میں آیا۔"

(ڈاکٹر محمود الرحمن پاکستان)

صالحہ عابد حسین

پُرانی یادیں

شہ سوارِ عمر کچھ اس تیزی سے منزلیں مارتا ہے کہ اکثر انسان کو محسوس بھی نہیں ہوتا اور وہ بچپن اور جوانی کی منزلیں طے کر کے بڑھاپے کی سرحد پر اپنے کو کھڑا پاتا ہے۔ لیکن آج کے مصروف زمانے میں بہت کم اتنا وقت ملتا ہے کہ آدمی کچھ دیر رک کر ماضی پر نظر ڈالے، حال کو سوچے اور مستقبل پر غور کرے۔ ہاں بیماری، اگر شدید نہ ہو تو، ایک ایسی نعمت ضرور ہے جو کبھی کبھی آدمی کو اتنی مہلت دے دیتی ہے کہ حال کی کسی کھڑکی سے جھانک کر بچپن کے معصوم شوق اور جوانی کی امنگوں کو ایک نظر دیکھ کر اُس پُر مسرت معصوم زمانے کے تصور سے پھر دل میں یادوں کے چراغ روشن کرے۔

کچھ عرصہ ہوا مجھے اسپتال جانا پڑا۔ جاتے وقت بہت سے کاغذات وغیرہ چھانٹتے ہوئے اپنی آلوگراف بک مجھے نظر آگئی جو میں ساتھ لیتی گئی۔ جب تیمارداروں، ڈاکٹروں اور پُرسان حال سے کچھ دیر کو نجات ملتی تو میں اس ننھی سی خوبصورت یادگار کاپی کو لے کر بیٹھ جاتی۔ اس وقت یادوں کے کتنے دریچے میرے سامنے کھل جاتے۔ آج یہ شوق کتنا ہی بچکانہ کیوں نہ معلوم ہو اُس وقت ان محترم ہستیوں کے ہاتھ کی یہ ذراسی تحریر کتنی باعث فخر و مسرت معلوم ہوتی تھی۔ دو تین سال کے اندر اندر میرا یہ شوق ختم ہو گیا تھا مگر یہ پیاری تحریریں جن میں سے کئی ہندستان کی مایۂ ناز ہستیوں کی ہیں، آج بھی اتنی ہی پیاری ہیں بلکہ کچھ زیادہ عزیز ہو گئی ہیں اس لیے کہ اُن میں سے بعض ہستیاں آج اس دُنیا میں موجود نہیں۔ نرسنگ ہوم کے اندر اور باہر ایک شور و ہنگامہ برپا رہتا، پر میں اپنے کمرے میں تنہا یادوں کے چراغ جلائے بیٹھی رہتی۔

ایک ایک واقعہ، جب میں نے یہ دستخط لیے تھے، میرے ذہن کے پردے پر اُبھرنے لگتا۔

شاید ۱۹۴۰ء اپریل کا مہینا تھا اور میرا دستخط لینے کا شوق عروج پر تھا۔ اس زمانے میں میرے شوہر ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلے میں واردھا گاندھی جی کے پاس جارہے تھے۔ بڑی خوشامد کر کے میں نے اپنی کاپی اُن کے حوالے کی کہ گاندھی جی سے اس پر کچھ لکھوا کر لانا۔ معلوم ہوا گاندھی جی دس روپے فی دستخط فیس لیتے ہیں جو ہریجن سدھار فنڈ میں جمع ہوتی ہے۔ میرے شوہر واپس آئے تو آٹوگراف بُک پر گاندھی جی کے دستخط اور ایک نئی وضع کا چرخہ اُن کے ساتھ تھا۔ مہاتما جی نے خوشی سے دستخط کیے اور ایک چرخہ خریدنے کو کہا۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ اس کا کاتنا بھی اُن کے دستخط کی فیس میں شامل ہے۔ میں پرانی وضع کے چرخے پر تھوڑا سا کاتنا جانتی تھی۔ کوشش سے اس نئے چرخے پر بھی آگیا۔ اور کئی سال تک گاندھی جی کے حکم کی پابندی کے طور پر میں روز کچھ دیر چرخہ کاتتی رہی۔ بعد میں کاموں کی زیادتی، ذمہ داریوں کے بوجھ اور دوسری مصروفیتوں نے یہ عادت چھڑادی اور پھر بھول بھال گئی۔ مگر گاندھی جی کے ہاتھ کا اُردو میں لکھا اپنا نام اب بھی میری کاپی اور میرے دل میں محفوظ ہے۔ اُن کے دستخط بھی اُن کے معصوم لہجے کی طرح ہیں، بچکانہ اور دل کش "موہن گاندھی، سیواگرام"۔

میری کاپی پر سب سے پہلے دستخط ڈاکٹر ذاکر حسین کے ہیں۔ اُن کے حسین، باریک دل کش تحریر دیکھ کر اس زمانے کی ایک ایک یاد دل میں تازہ ہوگئی جب اُن سے ملنے اور باتیں کرنے کی سعادت ہر وقت نصیب ہو سکتی تھی، جب اُن کی دل میں اُترنے والی نصیحتیں زندگی کی مشعلِ راہ بنتی تھیں، اُن سے بحث مباحثہ ٹوک جھونک ہو سکتی تھی جب وہ صرف ہمارے ذاکر صاحب تھے۔ اُنھوں نے ۳۰ دسمبر ۱۹۳۹ء کو اپنے محبوب شاعر رومیؔ کی یہ رباعی میری کاپی پر لکھی تھی:

تشنگاں جویند آب اندر جہاں
آب ہم جوید بعالم تشنگاں
آب کم جو، تشنگی آور بدست
تا بجوشد آبت از بالاء دست

دوسرے دستخط جو ۱۰ جنوری ۱۹۴۰ء کو کیے گئے تھے میرے چچا خواجہ غلام السبطین کے ہیں۔

مرحوم مولانا حالیؔ کے نواسے تھے اور اس شعر کی سچی تصویر:

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

اُن کی فرشتوں کی سی نورانی صورت، پاکیزہ شخصیت، اُن کا سخاوت و فیاضی سے بھرپور محبت اور ہمدردی سے لب ریز دل اور اُن کی خدمت اور تیمار داری کی یاد جو ہر مریض اور دُکھی کے لیے ہمہ وقت مل سکتی تھی، آج بھی اُن کے چاہنے والوں اور جاننے والوں کی آنکھوں کو محبت کے آنسوؤں سے بھر دیتی ہے۔ دردِ دل کی لازوال دولت انھیں فیاض ازل نے بڑی سخاوت سے عطا کی تھی جسے زندگی بھر وہ لوگوں پر لٹاتے رہے۔ جو شعر انھوں نے میری کاپی پر لکھا وہ اُن کی شخصیت کا آئینہ ہی نہیں اُن کی بہترین وراثت بھی ہے جو میرے لیے حرزِ جان سے کم نہیں ہے

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

سن ۴۰ء کی گرمیوں کا زمانہ تھا۔ میں سری نگر اپنے بھائی کے یہاں گئی تھی۔ حُسنِ اتفاق سے اُسی زمانے میں پنڈت جواہر لال نہرو سری نگر تشریف لائے۔ اس وقت ہندستان کی حکومت اور کشمیر کی ریاست دونوں اُن سے ڈرتی اور اُن پر نظر رکھتی تھیں۔ حکامِ وقت اور اُن کی چاپلوسی کرنے والے پنڈت جی سے ملنے تک سے کتراتے تھے۔ مگر کشمیر کی قومی تحریک کے رہنماؤں اور عوام نے اپنے دیس کے اس مایۂ ناز سپوت کا دل و جان سے خیر مقدم کیا۔ کشتیوں کا بڑا شاندار جلوس نکالا گیا اور اُن پر عقیدت اور محبت کی برکھا کی گئی۔ اس سے پہلے میں نے اُن کی صرف دور سے جھلک دیکھی تھی۔ مگر اس بار اپنے بھائی کے گھر چائے کی دعوت میں انھیں نسبتاً قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ بھائی جان کو اُن کے خیر خواہوں نے بہت منع کیا اور سمجھایا تھا کہ وہ نہرو کو اپنے ہاں مدعو کر کے ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر حضرات اس دعوت میں شریک تک نہیں ہوئے۔ لیکن اس وقت سری نگر میں ہندستان کے اور بہت سے مشاہیر ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ لوگ اور خود کشمیر کے سرکردہ قومی کام کرنے والے ۱۸ر جون ۱۹۴۰ء کی اس یادگار پارٹی میں جمع تھے۔ اس موقعے سے فائدہ اُٹھا کر جھٹ میں نے اپنی آٹو گراف بُک نکالی اور اپنی چھوٹی بھتیجی کے سپرد کی اور اُسے بتایا کہ فلاں فلاں صاحبوں سے اُس پر دستخط کرا لائے۔

سب سے پہلے سر تیج بہادر سپرو نے لکھا، " تم جیو ہزار برس " اور نیچے اپنے دستخط کر دیے۔

پھر وہ پنڈت جواہر لال کے پاس گئی۔ ایک صفحے پر پنڈت جی نے اُردو میں اپنا نام لکھا۔ اس وقت مجھے یہ جان کر کتنی خوشی ہوئی تھی کہ جواہر لال نہ صرف اُردو میں دستخط کر سکتے ہیں بلکہ اُن کا خط اتنا صاف صحیح اور پاکیزہ ہے۔

اس دعوت میں آزادی کا ایک اور سچّا پرستار موجود تھا جس کا میرے دل میں بے حد احترام تھا اور ہے۔ آزادیٔ وطن کا یہ جاں باز سپاہی، سچّا مسلمان، پکّا قوم پرست، قربانی و ایثار کا دیوتا، جس نے آزادی سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی ظلم و ستم کے سامنے کبھی سر نہیں جھکایا۔ آج بھی چوبیس برس پہلے کے خان عبد الغفار خاں کی وہ وجیہ اور تندرست مسکراتی صورت میری نظروں میں پھر رہی ہے جب وہ کھڑے ہوئے میری بھتیجی کو دستخط دے رہے تھے۔ جو جملہ انھوں نے میری کاپی پر لکھا وہ اُن کی شخصیت کا آئینہ اور اُن کے عمل کی سچی تصویر کہا جا سکتا ہے:

" مذہب سچّائی، محبت اور خدا کی مخلوق کی خدمت ہے۔"

اور آج بھی میرا سر اُس عظیم شخص کے سامنے جھک جاتا ہے اور اس کے نقشِ قدم پر چلنے کی دل میں تمنّا پیدا ہوتی ہے۔

عزیز جہاں بیگم، جن کا نام لیتے وقت آنکھیں ہی نہیں دل بھی رو رہا ہے، ابھی سال بھر پہلے مجھ سے بچھڑی ہیں۔ وہ میری عزیزہ ہی نہیں سب سے گہری، پیاری مخلص دوست بھی تھیں۔ ہر دُکھ سکھ کی ساتھی، ہر رنج و راحت کی شریک۔ وہ ایثار و خدمت، محبت و ممتا کی ایک ایسی دل کش مورتی تھیں جن کی مثال ڈھونڈے سے بھی کم ملتی ہے۔ ساتھ ہی سچی خدا پرست، مومنہ بی بی۔ جب وہ عبادت کرتیں تو ان کے چہرے پر حضورِ قلب کی جو کیفیت اور آنکھوں میں جو تاثر ہوتا تھا وہ لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ شعر جو اُنھوں نے میری کاپی پر لکھا تھا، شعر نہیں اُن کے دل کی واردات ہے سے میں نے پایا ہے اسے اشک سحر گاہی میں جس دُرِ ناب سے خالی ہے گہر کی آغوش

میری ایک اور نہایت عزیز دوست صفیہ جس نے جوانی میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی ایک غیر معمولی شخصیت کی مالک تھی۔ اُس کی ذہانت اور قابلیت کی اسکول سے لے کر یونی ورسٹی تک دھاک بیٹھی رہی۔ اس کے خلوص و محبّت پر عزیز دوست جان دیتے تھے۔ اُس کے دل میں اپنے دیس کی بڑی محبّت تھی۔ اپنی زبان اور تہذیب کی وہ بڑی دل دادہ تھی۔ دونوں

اور عزیزوں سے سچّی، پُرخلوص، بے لاگ محبت کرتی اور ہر ایک کی خدمت کا گہرا جذبہ دل میں رکھتی تھی۔ اس میں لکھنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ پڑھنے اور پڑھانے کا بے حد شوق تھا۔ وہ کیا کیا کر سکتی تھی؛ کیا بن سکتی تھی؛ لیکن ایک شعلۂ مستعجل کی طرح بھڑکی اور بجھ گئی۔ بچوّں کی یہ جاں نثار ماں، شوہر کی یہ عاشق زار ستی مزاج بیوی، ناقدر شناسی، بے مہری اور بے وفائی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ وہ جو ہر ایک کو پیاری تھی، جس کے دل میں چاہنے اور چاہے جانے کا بے پناہ جذبہ موج زن تھا۔ شمع کی طرح اپنی آگ میں گھل گھل کر ختم ہو گئی۔ اُس کی یاد میرے دل میں کچھ ایسی کھٹک پیدا کر دیتی ہے جیسے کسی زخم میں کانٹا چُبھ کر ٹوٹ جائے۔ اُس نے ۳۰ مارچ ۱۹۴۰ء کو جب یہ شعر لکھا تھا، اُس وقت کیا کیا تمنائیں اس کے دل میں نہ ہوں گی۔ شاید وہ خود ایسی رہنما بن سکتی تھی مگر ؏

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

میری کاپی پر اُس نے لکھا تھا ؎

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

میری دوسری بہت پیاری دوست قدسیہ زیدی تین سال پہلے اچانک اپنے بے گنتی دوستوں اور چاہنے والے عزیزوں سے مُنہ موڑ کر، اپنے پھیلے ہوئے بڑے بڑے کاموں کو (جن میں ہندستانی تھیٹر کی تعمیر و ترقی اور بیسیوں کتابوں کا ترجمہ، تالیف اور اشاعت بھی شامل تھی) ادھورا چھوڑ کر خدا کو پیاری ہو گئیں۔ اور اپنی نہ مٹنے والی یاد سیکڑوں دلوں میں کھٹکتی چھوڑ گئیں۔ قدسیہ بڑی باغ و بہار طبیعت کی، اور مرنجان مرنج انسان تھیں جن کو دُنیا کی ہر چیز سے دلچسپی تھی۔ جس کام کا بیڑا اُٹھا لیں اُسے پورا کیے بغیر ہٹ جانا اُن کی شرع میں منع تھا۔ یہ شعر جو ۹ جولائی ۱۹۴۲ء کو اُنھوں نے میری کاپی میں لکھا تھا ان کے ارادوں کی بلندی اور شخصیت کی مضبوطی کی طرف اشارہ کرتا ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خواجہ غلام السیّدین خوش نصیبی سے صرف میرے بڑے بھائی نہیں میرے سب سے گہرے دوست بھی ہیں اور رہنما بھی۔ بچپن سے لے کر اب تک ان کی نصیحت اور مشوروں نے ہر منزل پر

میری رہنمائی کی ہے۔ یہ اُن کا محبوب شعر ہے اور اپنے اُن چھوٹوں کو جنھیں وہ بہت عزیز رکھتے ہیں عطا کیا کرتے ہیں جو اُن کے لیے نصیحت بھی ہے اور شمع راہ بھی ہے

شمع کی طرح جیو بزم گہِ عالم میں
خود جلو دیدہ اغیار کو بینا کر دو

"جلو" کی جگہ "جیو" اُن کی جدت ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی ۱۴ر دسمبر ۱۹۴۰ء کو جامعہ تشریف لائے۔ میں نے اپنے شوہر کو آٹوگراف بک دی کہ اُن سے دستخط لے لیں۔ میں اُس وقت تک پردہ کرتی تھی۔ اس لیے سامنے نہیں گئی۔ اُنھوں نے کاپی پر لکھا:

نِعْمَ امتاعُ الدُّنیا المرأۃ الصّالحۃ

اور جب اُن کو یہ معلوم ہوا کہ میرا نام ہی صالحہ ہے تو حیرت آمیز مسرت کے ساتھ کہا "بہت خوب"۔ پھر فرمایا "واقعی نیک عورت دُنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے"۔

ڈاکٹر تارا چند میرے شوہر کے بہت پرانے اور محترم دوست ہیں اور اس ناتے مجھ پر بہت شفقت فرماتے ہیں۔ اُن کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ہندستان کی مشترک تہذیب و کلچر ایک دل کش مجسّم صورت میں سامنے ہے۔ وہ فارسی زبان کے ماہر ہیں اور اُردو اُن کی مادری زبان ہے۔ اتنی رواں، شگفتہ، دل کش اُردو بہت کم لوگ لکھ سکتے ہوں گے جیسی ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں، اور جب بولتے ہیں تو وہ شستہ با محاورہ پیاری زبان کہ سبحان اللہ! اُنھوں نے ۲ر اکتوبر ۱۹۴۴ء کو میری کاپی پر جو لکھا ایسا لگتا ہے کہ خود اُن کی سیرت اور اُصول کا آئینہ دار ہے:

تسخیرِ این دو عالم، تفسیرِ این دو حرف است
با دوستاں تلطف، با دشمناں مدارا

سید مسعود حسن رضوی ادیب اُردو کے مانے ہوئے ادیب و نقّاد ہیں۔ خاص کر انیس پر اُن کی گہری نظر ہے اور انیس کی ایک پرستار ہونے کی وجہ سے مجھے بھی اُن سے عقیدت ہے۔ جب ۱۹ر مارچ ۱۹۴۴ء کو وہ میرے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے، میری کاپی پر لکھا ان کا یہ خوبصورت جملہ اُسی وقت کی یادگار ہے۔ "جو دوسروں کی خوشی میں خوش نہیں ہوتا وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتا"۔

آخری صفحوں میں سے ایک پر مجھے اپنے مولانا کے ہاتھ کی پختہ اور شکست تحریر نظر

آئی/جو بڑی اچھی طرح پڑھی جا سکتی ہے۔ اس وقت تک مجھے مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا۔ وہ دہلی تشریف لائے تھے اور میں نے پردے کے اندر ہی سے یہ کاپی ان کے پاس بھجوائی تھی۔ یہ اُن کی پہلی تحریر ہے جو مجھے عطا ہوئی تھی۔ اس کے بعد اُن کی کئی اور تحریریں مجھے نصیب ہوئیں۔ مگر اس پہلی تحریر کو پاکر فخر و مسرّت سے میرے دل کی کیا کیفیت تھی وہ لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ ہاں اُس کی یاد اب تک دل میں باقی ہے۔ پہلی جنوری ۱۹۴۱ء کو اُنھوں نے لکھا تھا ؎

طبعے بہم رساں کہ بہ سازے بہ عالمے
باہمّتے کہ از سرِ عالم تواں گزشت

عام سیدھے سادے آدمی اور صاحبِ عزم و حوصلہ دونوں کے لیے اس شعر میں رہنمائی موجود ہے۔ مولانا اس وقت مجھے جانتے نہیں تھے مگر انھوں نے کامیاب زندگی کے دونوں گُر میرے سامنے پیش کر دیے کہ جس کی قابلیت و صلاحیت ہوگی وہی اس شعر سے اخذ کرلے گی۔

(ہندوستان کی چند مایۂ ناز ہستیوں کا عکسِ تحریر)

صالحہ عابد حسین

آج کا کبیر

میں اس کا کچھ نہیں تھا۔ وہ بھی میری کچھ نہیں تھی۔ مگر میں ہی اس کا سب کچھ تھا اور وہ میری سب کچھ تھی ہم دونوں ایک دوسرے کے دکھ درد کے ساتھی، دوست، تیمار دار، غم گسار، ہمدرد تھے مجھ بڈھے کی اولاد نے بڑے بڑے عہدے اور پیسہ پاکر مجھے چھوڑ دیا تھا۔ وہ جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی جو دو تین بچے ہوئے وہ کبھی بیماریوں کا شکار ہوکر خدا کو پیارے ہو چکے تھے۔ اُس کی سسرال سے میرا دور پرے کا رشتہ تھا۔ اور اس طرح ہم دو سہارا بڈھے اور جوان ایک دوسرے کا سہارا بن گئے۔ اس کا کوئی نہ تھا اور تھا بھی تو صاحب غرض۔ کوئی اس کی جوانی کو اسکوق کو برباد کرنے پر تل گیا۔ ایک آدھ نے نکاح کا پیام دیا جس کو اس نے ٹھکرا دیا ارے قسمت میں سہاگ ہوتا تو رانڈ ہی کیوں ہوتی ایسا چاہنے والا میاں کیوں بچھڑ جاتا۔"

چند مہینے ہی سے ساتھ میں وہ مجھے بابا کہنے لگی اور اس نے ایسی خدمت کی کہ میری اولاد نے سوچا بھی نہ ہوگا۔ مجھے تو اس کے بیٹیوں سے زیادہ محبت تھی ہی۔ وہ کوئی غیر نہیں میری اپنی بیٹی ہے۔ مگر جوانی کی عمر امنگوں کی عمر، محبت کرنے اور چاہے جانے کی عمر، ماں کی مامتا کی تڑپ۔ مجھ بڈھے کی محبت ان ساری محرومیوں کا ازالہ کیسے کر سکتی تھی۔ اور اس نے اس کا حل سوچ لیا یا خود بخود اس کو مل گیا۔

کسی دور پرے کے رشتے کے دیور یا جیٹھ کی بیوی ایک ننھی سی بچی چھوڑ کر مر گئیں۔ کوئی اُسے پالنے پر راضی نہ ہوا اور میری بیٹی ان سے نکاح پر تیار نہ ہوئی مگر اس

کی بچی کو پالنے پر تیار ہو گئی۔ اور پھر تو تین چار بے ماں کے باپ بے سہارا بچے پلے اس نے پال ڈالے۔ لڑکیوں کی شادیاں کر دیں۔ اپنے جیسے غریبوں کے لڑکے پڑھ کر، کام سیکھ کر اُسے چھوڑ کر اور دیسوں کو چلے گئے۔

اور ہم دونوں بابا اور بٹیا ایک پرانے گھر میں جس کی دیواریں کچی اینٹوں کی تھیں اور فرش مٹی سے لپا ہوا، کواڑوں کی درازوں سے ٹھنڈی ہوا آتی تھی۔ جس میں دو کوٹھریاں تھیں جنھیں وہ کمرے کہا کرتی تھی ایک برآمدہ ــــ بڑا سا صحن جس میں اس نے پھولوں کے پودے لگا رکھے تھے، گلاب، موتیا، چنبیلی اور ہار سنگھار کا درخت جن کو وہ بچوں کی طرح چاہتی اور بچوں کی طرح سیوا کرتی تھی۔ شاید اس سے اس کی اندر سے امنڈنے والی مامتا کو سکون ملتا تھا۔ اور باقی وقت سلائی کڑھائی کر کے، کچھ پیسا کما لیتی تھی اور میری مختصر پنشن اور اس کی محنت کی کمائی مل کر ہم دونوں کا خرچ چل جاتا۔

ہمارے پڑوس میں ایک ادھیڑ عمر کی ڈاکٹرنی رہتی تھیں۔ تھیں تو عیسائی، اور بڑی مذہبی، مگر بے حد محبت اور دردمند دل رکھتی تھیں اور بلا تفریق مذہب و ملت ذات پات ہر بیمار، مریض، دکھی کی خدمت کرتیں۔ دوائیں دیتیں۔ ضرورت ہوتی تو پیسے سے مدد بھی کرتی تھیں۔ میری بٹیا کی اور اس ڈاکٹرنی کی گاڑھی چھنتی تھی۔ اور جب مجھے دمہ کا دورہ پڑتا تو جھٹ بٹیا اسے بلا لاتی جسے میں مس مسیح کہا کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شفا تھی اور زبان میں ایسی مٹھاس جو درد و دکھ کو آدھا کر دیتی۔

مس مسیح کی ماما اور بھائی سے بھی ہمارے تعلقات تھے اور ہم ایک کنبے کی طرح سے ہو گئے!

اور یوں ہماری زندگی مسرت اور خوش حالی سے نہ سہی سکون سے گزر رہی تھی۔

مگر ایک دن ایک عجیب طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔

میں اندر اپنی کوٹھری میں پڑی ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ سنت کبیر اس کتاب میں اس کی بانیاں تھیں، اس کی سیوا اور پریم بنی نوع انسان انسان خاص کر غریبوں اور دکھیوں

کے لیے اس کے دل میں درد تھا۔ جو غریبوں اور مصیبت زدوں کا مددگار اور ان کے لیے جان دینے پر تیار ہو جاتا تھا۔ جسے خود نہ معلوم تھا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے کس کی اولاد ہے جسے ایک غریب بے اولاد عورت نے زخم کھا کر پال لیا تھا اور پھر وہ اس کی جان بن گیا تھا۔ لڑکپن ہی سے اس کے منہ سے ایسے بول نکلنے لگے تھے۔ جن میں شعر کا سا اثر اور آہنگ۔ کبیر کی بانیاں جو کئی زبانوں کے میل سے خود بخود بے ساختہ اس کے ذہن میں آتیں اور زبان سے ادا ہوتیں اور لوگوں کے دل میں اتر جاتی تھیں۔ ان میں وہ جذبہ تھا جسے آج ایکتا یا قومی یک جہتی بھی کہا جا سکتا ہے۔

میرے دل میں سنت کبیر کی بڑی عزت تھی اور جب کہیں سے مجھے ان کے حالات یا ان پر مضمون یا ذکر مل جاتا ضرور پڑھا کرتا تھا۔ کبھی بٹیا کو سناتا تو بٹیا پوچھتی بابا یہ سچ مچ تھے۔ کوئی انسان یا دیوتا، یا فرشتہ۔ یہ صرف ایک کہانی ہے۔ اور میں سوچتا — سوچتا اور کہتا — میرے خیال میں وہ سب کچھ تھا — سب کچھ — اس دن بھی میں ان کے بارے میں پڑھ رہا تھا کہ ۔ ۔ ۔ ۔

باہر سے شور و غل کی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی طوفان آگیا ہو۔ عورتوں کی دائیں بائیں، بچوں کی چیخ پکار مردوں کی گالیاں اور اس شور میں سب سے بلند آواز میری بٹیا کی تھی۔ بھاگ جاؤ، بھاگ جاؤ، خبردار جو اسے ہاتھ لگایا۔ لاؤ — اسے مجھے دو — مجھے دو اسے — یہ میرا ہے — میرا بچہ۔

میں سر سے پیر تک لرزنے لگا۔ یہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ کس کا بچہ — کون بچہ — اس کا بچہ — نہیں نہیں نہیں — یہ نہیں ہو سکتا۔

اچانک وہ کسی چیز کو چھاتی سے چپکائے کوٹھری میں گھسی۔ ایک پھٹی دُلائی میں کچھ لپٹی ہوئی کوئی چیز۔ شکر ہے وہ دلائی میرے گھر کی نہ تھی۔ باہر کھڑی عورتیں اپنے بچوں کو کوس رہی تھیں اور عورتیں کچھ بک رہی تھیں۔

"ارے بٹیا — یہ کون ہے — کیسا بچہ — تم کیا بک رہی ہو گی۔ اتنے ہی میں مس مسیح بھی اندر آگئیں۔ بابا آپ اتنا زور سے نہ بولیے۔ آپ کا سانس پھول رہا ہے"۔

"مگر یہ بچہ — یہ بٹیا کی گود میں کس کا بچہ ہے" میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ میں بتاتی ہوں آپ کو بابا" ڈاکٹرنی نے میری پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا۔

میں اپنے گھر کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ سامنے کی زمین پر بہت سے بچے کھیل رہے تھے۔ ایک عورت۔ کہ لڑکی۔ ایک کالی چادر سمیٹے آئی۔ ایک بچے کو اپنے پاس اشارے سے بلایا۔ اور ایک گٹھری سی اس کی گود میں دے دی اور کہا جاؤ سامنے والے گھر میں یہ دے آؤ" سامنے والے تو سبھی گھر تھے۔ لڑکے نے گٹھری سی اس کو گود میں دے دی میں دیکھا ایک ننھا سا بچہ ہے۔" اُدھر سے میں ترکاری لے کر آرہی تھی بابا" بٹیا نے گٹھری کو سینے سے چپکائے چپکائے کہا۔ بچے اسے نوچ کھسوٹ رہے تھے، بے اختیار میں نے اُسے گود میں اٹھالیا۔ اور سوچے سمجھے بغیر میرے مُنہ سے نکلا خبردار۔ یہ میرا بچہ ہے جو اسے ہاتھ لگایا تو تو. . . ."

"یہ کسی سخت دل حرامی ماں باپ کا بچہ ہے۔" میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔

"نہیں بابا۔ یہ بچہ تو معصوم ہے۔ حرامی تو اس کے ماں باپ ہیں۔" مس مسیح بولیں۔
"نہیں ڈاکٹرنی جی۔ ماں نہیں۔ صرف اس کا باپ جو کسی معصوم لڑکی کو دھوکا دے کر خود غارت ہوگیا۔ مگر میں اسے پالوں گی۔ ہاں بابا۔ میں اسے پالوں گی یہ میرا بچہ ہے۔"
میں عجیب کش مکش میں تھا، غصہ، رحم، پریشانی، رنج، اور بٹیا کی ضد پر الجھن۔ وہ کہے جارہی تھیں "اب تک رشتے ناتے کے بچے پالے ہیں ہم نے بابا۔ اب ہم اللہ واسطے سے اس بے گناہ معصوم کو پالیں گے۔" اور ڈاکٹرنی مس مسیح کہہ رہی تھی ہاں تم دنیا والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔" اور مجھے بے اختیار یہ شعر یاد آگیا ؎

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

اور وہ دونوں بچے کو لے کر دوسری کوٹھری میں چلی گئیں۔

مس مسیح کی مہربانی، بٹیا کی خدمت، کچھ ہمدرد لوگوں کی فیاضی کہ اور ہمارا معصوم بچہ روز بروز پیارا اور تندرست ہوتا گیا اب تو ڈاکٹرنی کی ماما اور برادر بھی اُسے پیار کرنے لگے تھے اور مجھے تک اس پر ترس نہیں پیار آنے لگا تھا۔ اور بٹیا کی تو وہ جان تھا۔ اس کے چہرے پر بڑھاپے کی جگہ جوانی کا نکھار آگیا تھا اور جب وہ بچے کو لے کر چھاتی سے لگاتی تو جانے

کہاں سے ایک عجیب حُسن اس کے چہرے کو نکھار دیتا۔

بچے کے نام رکھنے پر خوب خوب بحثیں ہوئیں۔ پڑوسی عورتوں کو اب دلچسپی ہو گئی تھی اس سے۔ کوئی کہتی مسلمان کا ہے، کوئی کہتی نہیں ہندو لگتا ہے۔ ایک کی تشخیص تھی سکھ ہے اور رما کہتیں نہیں عیسائی ہے۔ دیکھ لو مسیح کے چہرے کی معصومیت ہے نا اس کے مُنہ پر!

اور پڑوس کے مجذوب بڑے میاں آنکھیں بند کر کے کہتے، یہ آدم کی اولاد ہے۔ آدم کی — نام سے کیا ہوتا ہے۔ سری رام ہو یا عبدالکریم، نانک سکھ ہو یا جوزف —"

میں کہتا میاں جی سچ ہے سب آدم کی اولاد ہیں۔

اور پھر ایک دن بچے کو سردی لگ گئی۔ دو تین دن تو گھریلو دواؤں سے کام چلا۔ مگر حالت بگڑنے لگی تو مس مسیح نے اُسے اسپتال میں داخل کر دیا۔ ایک بڑے اسپتال میں جس میں وہ خود کام کرتی تھی۔ اور ہر ممکن علاج کیا۔ مگر وہ اچھا نہ ہو رہا تھا۔ اُسے خون کی ضرورت تھی۔ خون — میں بڑھا — بٹیا نہ مانے مگر ادھیڑ اور کمزور، ڈاکٹرنی کے خون کا گروپ ملتا نہ تھا۔ اور کوئی اور کیوں دے ایسے ناجائز بچے کو خون۔ ڈاکٹرنی کو پڑوس کے ایک جوان کو تھا وہ اسے پکڑ لائی۔ تمھیں خون دینا پڑے گا — ہم پیسا دیں گے۔ مگر وہ اُسے لال لال آنکھوں سے گھورتا اور گالیاں بکتا بھاگ نکلا۔ میں کیوں کسی کے . . . بچے کو اپنا پاک خون خون! پاک خون!!

اس کی بیماری نے بٹیا کی جان پر بنا دی تھی۔ خرچ بہت تھا، نہ ہمارے بس کا نہ مس مسیح کے بس کا۔ اور پھر ایک سوشل ورکر خاتون نے تجویز کی اسے کسی بے اولاد پیسے والے کو دے دو۔ آج کل تو یہ عام بات ہے جان بھی بچ جائے گی۔ اور پل بھی جائے گا۔ بٹیا رو رو کر جان دیے دیتی تھی مگر مس مسیح نے جانے اُسے کیسے سمجھایا۔ کیا کہا کہ وہ راضی ہو گئی پہلے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی اب صرف آنسو بہاتی رہی۔ اور پھر ایک دن مس مسیح کے ساتھ ایک جوان خوبصورت گوری عورت اسپتال میں آئی۔ گورا چہرہ، نیلی آنکھیں اس نے مجھ سے اور بٹیا سے انگریزی میں کچھ کہا۔ ڈاکٹرنی نے اس کا ترجمہ کیا "آپ لوگ روئیں نہیں۔ میرے اولاد نہیں ہے۔ میں اسے پالوں گی پڑھاؤں گی اور اسے ایک، بڑا آدمی بناؤں گی اور آپ کے پاس

بھی لاؤں گی۔ فکر نہ کریں یہ ہم سب کا بچہ ہے۔ انسانیت کا مظہر ہے۔

میرے آنسو جھریوں میں چھپ گئے مگر بٹیا کی ہچکیاں ڈوبتہ دبا نہیں پا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا، آخری بار بچے کو اپنے پھڑکتے سینے سے لگایا منہ چوما اور فرنگسن کی گود میں دے دیا۔

فرنگسن نے بھی بچے کو چھاتی سے لگایا تو اس کی آنکھوں میں ممتا نظر آ رہی تھی۔

"بابا اس کا نام؟"

"کبیرا" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ آج کا کبیرا۔

اور پھر میرا کبیرا، ہندی کبیرا اس غیر عورت کے سینے سے لگا مغرب کی طرف روانہ ہو گیا۔ شاید مغرب کے لوگوں کو محبت کا، اخوت کا، انسانیت، مساوات اور شرافت اور انسانیت کا پیام دینے سبق سکھانے۔

"نہ رو میری بچی" میں نے بٹیا کو سینے سے لگایا، ہمارا بچہ۔ مغرب کے لوگوں کو انسانوں پر ظلم و ستم سے شاید باز رکھے گا۔ جو مغرب والوں کو سنت کبیر کا پیغام پہنچائے گا۔ خدا نے چاہا تو۔

میرے ہاتھ آسمان کی طرف بلند تھے۔
اور بٹیا میری گود میں بے ہوش پڑی تھی۔

اپنے پیاروں سے آخری باتیں

نسیم جاگو کمر کو باندھو
اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

مصداق
یکم مئی ۱۹۷۰ء

کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن رضاً بقضاءہٖ وتسلیماً لامرہٖ

تہمتیں چند اپنے ذمّہ دھر چلے
کس لیے آئے تھے ہم کیا کر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے
دوستو! دیکھا تماشا یاں کا بس
تم رہو اب۔ ہم تو اپنے گھر چلے
دردؔ کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے؟

یہ میری عادت ہے سفر پہ جانا ہوتا ہے تو دنوں پہلے سامان نکالنا، باندھنا چھانٹنا شروع کر دیتی ہوں اس کی وجہ سے اکثر پریشانی بھی اٹھانی پڑتی ہے اکثر اس قبل از وقت تیاری سے کام دگنا ہو جاتا ہے مگر اگلی بار پھر یہی کرتی ہوں۔ عادت تو عادت ہی ہے۔

کچھ یہی حالت آج کل آخری دائمی سفر کے احساس سے ہے۔ جی چاہتا ہے جو کچھ میرے پاس ہے جلد سے جلد بانٹ دوں۔ جن لوگوں کی امانتیں۔ روپے، زیور وغیرہ رکھا ہے وہ ان کے سپرد کر دوں جو تھوڑا بہت پیسا اور یہ گھر وغیرہ ہے اس کے بارے میں فیصلہ کر لوں۔ لکھ دوں۔ بتا دوں کہ میرے بعد ان کو کس کو دیا جائے جو گھر داری اور ذاتی ضرورتوں کا سامان لگ بھگ چالیس برس شوق سے جمع کیا ہے وہ اپنے پیاروں کو دیدوں اور میں سبکدوش ہو جاؤں، ہو سکتا ہے سفر ابھی دیر میں شروع ہو۔ ہو سکتا ہے میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں اور ان چیزوں کی، جن کو تقسیم کر دوں گی ضرورت پڑے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سفر کی تیاری حسبِ عادت، قبل از وقت ہو۔ مگر..... کیا یہ بہتر نہیں کہ انسان پہلے سے تیاری کرے۔ بہ نسبت اس کے کہ بالکل ہی تیار نہ ہو۔ میرا جی چاہتا ہے کہ مجھے اب یہ سب الجھنیں نہ ستائیں۔ بس میں جی لگا کر اپنے خدا کی یاد کروں جو تھوڑی بہت عبادت کرتی ہوں اس میں حضورِ قلب پیدا ہو اور بس اپنا ناول لکھوں اپنی داستانِ حیات لکھوں اور اپنے پیاروں سے جی بھر کر باتیں کروں اور اگر کسی دن اچانک بلاوا آجائے یا خدا نخواستہ زبان یا ہاتھ پیر بیکار ہو جائیں (معاذاللہ... خدایا مجھے

اس آفت سے محفوظ رکھیو) تو میں اپنے کو ہلکا پھلکا محسوس کروں جو اپنا قرض ادا کرکے اب سفر کے لیے تیار ہو!

خوش وخرّم — ہنستی ہوئی جاؤں!

موت ایک اٹل حقیقت ہے نہ اس کا کوئی دن مقرر ہے نہ وقت۔ چاہے تو آن کی آن میں کڑیل جوان کو ختم کر دے اور اس کی مصلحت نہ ہو تو ضعیف وکمزور برسوں ایڑیاں رگڑتے رہیں۔ میری تمنّا اور خدا سے دعا ہے کہ وہ مجھے چلتے ہاتھ پاؤں بغیر کسی کا بھی محتاج ہوئے۔ نہ جسمانی طور پر نہ مالی لحاظ سے، اس دنیا سے اٹھالے۔ اپنے بعض پیارے دوستوں اور عزیزوں کی حالت بعض وقت خود اُن کی اولاد کے ہاتھوں، معذوری اور بیماری میں جو دیکھی ہے اس نے میرے ذہن پر ایک کرب کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ دنیا میں ماں باپ اور اولاد سے زیادہ پیاری اور چاہنے والی کوئی ہستی نہیں ہوتی پھر بھائی بہن ہیں جو سچے دل سے ایک دوسرے کو چاہیں تو ساری دنیا کی محبتیں ان کی الفت پر قربان کی جا سکتی ہیں۔ میاں بیوی یا محبّ ومحبوب کی محبت کا تو ذکر ہی کیا ہے لیکن آج کا زمانہ کچھ ایسا بحرانی ہے، دنیا میں خود پرستی اور خود غرضی کچھ اتنی بڑھتی جا رہی ہے کہ یہ پیارے بندھن ٹوٹتے سے محسوس ہوتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ یہ عام حالت ہو۔ جانتی ہوں کہ جہاں ایسی مثالیں ہیں وہاں ایثار محبت اور خدمت کی مثالیں بھی کم نہیں لیکن اپنے لیے میری یہ آرزو ہے، دعا ہے اور اپنے رحیم وکریم خدا سے یہ امید ہے کہ اگر میں نے دنیا میں کچھ نیک کام کیے ہیں، کچھ خدمت کی ہے تو مجھے معذور، مجبور اور محتاج بنا کر زندہ نہ رکھے گا۔ میں اپنے پیاروں کو اپنے بھائی جان، اپنے شوہر، صغریٰ اور اقبال اور اس کے سب بہن بھائی، اپنے بھائیوں اور بہنوں کی اولاد کو زندہ سلامت اس دنیا میں چھوڑ کر جاؤں یہی میری ناچیز خدمتوں کا بدل ہوگا۔ اس دنیا میں، میں محنت کش طبقے سے ہوں۔ میرے والد مزدور تھے میرے بھائی مزدور ہیں۔ میرا شوہر مزدور ہے، میں خود مزدور ہوں۔ مزدوری جس میں ذہن، دماغ، ہاتھ، قلم سب کا برابر کا حصّہ ہے!

اور اسی مزدوری سے گذشتہ ۳۶ سال میں میں نے اور عابد صاحب نے دن رات مسلسل جدوجہد کرکے اپنی روزی کمائی ہے۔ اپنے خاندان کو پالا ہے۔ حدبھر دوسروں

کی مدد کی ہے اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا، بے شک میں اپنے پیارے بھائی جان کی ممنون احسان ہوں. میرا رواں رواں اس محبت اور سلوک میں ڈوبا ہوا ہے جو اماں کے مرنے کے بعد سے، آج تک مجھے ان سے ملی مگر وہ میرے باپ، بھائی، گرو، اور بہت محبوب ہستی ہیں ان کا احسان نہیں ایسا پریم ہے جس کا نہ کوئی بدلہ ہوتا ہے اور نہ جس کا ذہن پر بار ہوتا ہے۔

اور عابد صاحب . . . میرے رفیقِ حیات میرے سچّے دوست اور سچ مچ میرے رہنما ہیں۔ ان کی صحبت اور محبت کی دولت مجھے نہ ملی ہوتی تو میں کیا ہوتی؟ اس کا میں تصوّر بھی نہیں کر سکتی۔ اس سے کم درجہ کے اخلاق و سیرت کے انسان سے کیا میں اس طرح نباہ کر سکتی تھی؟ کیا وہ احترام اور عزت انھیں دے سکتی تھی جو عابد کے لیے میرے دل میں ہے؟ اس کا جواب میرا دل اور دماغ دونوں نفی میں دیتے ہیں۔ مجھے اس رفاقت کی بڑی کڑی قیمت بھی چکانی پڑی ہے، یہ میں جانتی ہوں۔ ۱۹ برسوں کی کم تعلیم یافتہ الھڑ اور کچّے ذہن کی لڑکی کے لیے ایک چٹان کی طرح مضبوط سیرت اور شخصیت کے انسان سے جس کے بے لچک اصولوں اور بلند اخلاقی پابندیوں کو سہارنا بڑوں بڑوں کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ بڑا کڑا امتحان تھا اس راہ میں بعض وقت مجھے دکھ اٹھانے پڑے ہیں۔ دل شکنی اور دل آزاری بھی جھیلنی پڑی ہے۔ مفلسی، کٹھنائی، عیش و راحت کی زندگی سے دوری، اپنے سے کمتر اور گھٹیا لوگوں کی شیخی، برتری اور نمائش پسندی کو بھی جھیلنا پڑا ہے۔ کبھی کبھی میں اپنا صبر و قرار بھی کھو بیٹھی ہوں! لیکن — میرے ساتھی نے ہر کھائی، ہر چوٹ، ہر مصیبت، ہر راحت کے وقت میرا ساتھ دیا ہے۔ انھوں نے میرے صبر اور برداشت کو آزمایا ہے مگر مجھے بد دل نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے تنبیہ کی ہے مگر بے اعتمادی نہیں کی ہے۔ ان کے سہارے کی دولت پا کر میں نے ۳۶ سال اسی جدّوجہد میں بسر کیے ہیں کہ اخلاق، ذہن اور دیانت و بے ریائی کی اس بلندیوں کو کس طرح چھو سکوں جس پر میرا شوہر براجمان ہے لیکن اب تک اکثر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے بہت اونچائی پر بیٹھے ہیں۔ ان کے دوسرے بہت سے ساتھی جو دنیاوی حیثیت سے ان سے کہیں زیادہ اونچے، سیاسی حیثیت سے بڑے آدمی، شخصیت اور قابلیت کی شہرت

ہیں ان سے کہیں بڑھ کر سمجھے جاتے ہیں۔ وہ ان کو کیا پہچان سکتے ہیں۔ ان تک کیسے پہنچ سکتے ہیں؟ یہ سوال اکثر میرے ذہن میں آتا رہتا ہے کہ کیا کبھی کوئی ان کو پوری طرح پرکھ سکے گا۔ اس سیدھے سادے سچ مچ کے مزدور انسان کو؟)

سوچتی ہوں۔ جتنا سوچتی ہوں میرا دل شکر و احسان کے جذبے کے ساتھ جھکتا چلا جاتا ہے اپنے خالق و معبود کے سامنے جس نے مجھے ایسا شوہر دیا۔ میں جو ہوں۔ جیسی بھی ہوں۔ اس میں جو اچھائیاں ہیں۔ ان میں بڑا حصہ عابد اور بھائی جان کا ہے۔ خامیاں ظاہر ہے میری اپنی ہیں۔

میں اولاد کی نعمت سے محروم رہی۔ ایک بچی ہوئی مگر زندہ نہ رہی۔ آہ! اس کا سالہا سال تک میں نے کتنا غم منایا ہے۔ وہ غم جسے میرے سوا کسی نے نہ جانا نہ سمجھا (ہاں بعد میں میرے فن پاروں میں اس غم کی جھلک دیکھ کر کچھ لوگوں نے اس کا ذرا سا یہ ضرور دیکھا ہے) میری روح کی گہرائیوں میں ماں بن کر چاہنے اور چاہے جانے کی جانے کیسی لگن کیسی پیاس تھی جو کبھی نہ بجھی۔ اس بچی کا غم تو ایک سایہ کی طرح پیچھا کرتا رہا۔ ایک ایسی ہستی جس کو نظر بھر کر دیکھا تک نہیں بھلا اتنی گہری محبت کا مرکز کیسے بن سکتی ہے؟ شاید یہ میرے تخیل اور تصور کا کوئی نقطہ تھا جسے میں نے مرکزِ محبت و غم بنا لیا تھا۔ آج ۳۵ برس بعد بھی وہ زخم میرے سینے میں۔ وہ نقطۂ الفت میرے دل میں جوں کا توں ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو اس خیال کے ساتھ میری آنکھیں ہمیشہ گرم گرم آنسو سے کیوں لبریز ہو جاتی ہیں۔ پہلے ان جانے میں اور پھر شعوری طور پر میں نے اپنے اس زخم کا مرہم تلاش کر لیا۔ میں نے سب سے پہلے اپنی بھانجیوں کو چاہا پھر بھتیجیوں، بھائی جان کی اولاد کو، پھر چھوٹے کے بچوں کو خاص طور سے ان کے بیٹے انور عباس کو وہ میرے خاندان کا واحد چشم و چراغ ہے۔ ان لوگوں نے بھی مجھے محبت دی، پھر میری نند کے بچے میرے پاس آکر باری باری رہنے لگے، ببن، بیگم، شبّو، اقبال اور جان ہار مختار۔ ان کی میں نے تھوڑی بہت تربیت کی ان کو چاہا انھوں نے بھی مجھ سے محبت کی، میری عزت کی میری خدمت کی۔ انیس اور اس کے بچے مجھے بہت عزیز رہے ہیں انھوں نے مجھے بہت محبت دی۔ میری خدمت کی اور اس محبت میں بھی انیس شامل ہے جس سے پہلی نظر ہی میں مجھے محبت اور ہمدردی ہوئی تھی۔ اس کی میرے دل میں

قدر بھی بہت ہے میرن صاحب کی بچی گوہر کو بھی میں نے اپنے پاس رکھا۔ اس کی تعلیم و تربیت کی، اور اپنے حتیٰ المقدور ان سب بچوں کی زندگی بنانے کی کوشش کی اور اُن کو چاہ کر اپنے درد محرومی کو بھلایا۔ میرن صاحب سے مجھے بہت محبت ہے اور ان کی کئی کمزوریوں کے باوجود ان کی عزت میرے دل میں ہے انھوں نے مجھے غیر ہوتے ہوئے وہ محبت اور عزت دی جو اپنا چھوٹا بھائی ہی دے سکتا ہے۔

اور شفاعت بہن !

کیا کہوں ان کے اور اپنے رشتے کے بارے میں۔

عجیب عجیب تجربے ہوئے مجھے اس دنیا میں !

جن سے محبت اور خلوص کی دولت کی امید نہیں یقین تھا ان سے نفرت بیزاری اور بدگمانی ملی !

جن سے نفرت اور دشمنی کا اندیشہ تھا ان سے قدر دانی، خلوص اور محبت ملی !

میں نے دنیا کے ساتھ کیا کیا، کیا نہیں کیا، یہ میں جانتی ہوں یا میرا خدا۔ دنیا والے تو کبھی کسی خلوص و محبت پر یقین نہیں کر سکتے !

لیکن شفاعت بہن کے لیے تو مجھے جتنا کرنا چاہیے تھا اس سے بہت بہت ہی کم کیا۔

مگر . . . . انھوں نے ذرا سے کیے کو حد سے زیادہ سمجھا۔

ان کا جو حق ان کو ملا۔ اور بہت کم ملا۔ اس کو احسان اور محبت گردانا۔ ان کے عزیزوں کے ساتھ جو کیا (جو اُن کے عزیز ہونے کی وجہ سے تو نہ کیا گیا) اس کی شکر گزار رہیں۔

انھوں نے ہمیشہ جس طرح میری تعریف خلوص سے کی ہے۔ مجھے سراہا ہے، مجھ سے سچ مچ چھوٹی بہنوں جیسی محبت کی ہے اگر اس طرز عمل میں۔ کچھ میرا شعوری یا غیر شعوری ہاتھ ہے !

اگر میرا رحیم و کریم خالق مجھے اپنی بخشش و کرم سے نوازے گا !

تو . . . . .

تو وہ میری شفاعت بہن کے اسی خلوص و محبت کی بدولت ہوگا . . .

مجھے اپنے ان سب بزرگوں سے، جو محبت و قدر دانی ملی اس کے لیے میں اپنے خدا کی احسان مند ہوں مجھے ان بچوں نے — بغیر استحقاق کے جو محبت اور پیار دیا۔ میری جو خدمت کی یہ میری خوش نصیبی تھی۔ آج کے اس دور میں۔ جب بیٹیاں ماں کو ذلیل کرتی ہیں۔ بیٹے ماں باپ کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ ہر محبت اور خلوص، پیسے، جاہ حشمت اور اقتدار کے کانٹے میں تولا جاتا ہے!

اس بحرانی دور میں . . .

مجھے کس کس سے کیا کیا نہ ملا!

میں اس پیار واپنائیت، اس خدمت اور محبت کے چھینٹوں سے اپنے دل و دماغ کو تازہ کرتی رہی ہوں اور اگر زندگی باقی رہی تو کرتی رہوں گی جو مجھے ادھر سے ملے جدھر سے لوگوں کو نہیں ملتے!

اور سب سے آخر میں —

دو چار باتیں میں اپنی صغریٰ سے کرنا چاہتی ہوں۔

صغریٰ — جانے کب اور کیسے تم میری بن گئیں۔ میں تمہاری بن گئی۔ میں نے تو اس سلسلے میں کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ جیسے اور سب سے محبت کی، سب کی خدمت کی ایسی ہی تمہاری کی۔ بس اتنا ضرور ہوا کہ تم سب سے کمسنی میں میرے پاس آئیں۔ اور تمہاری ساری تعلیم و تربیت اس کے بعد سے میرے ہاتھوں ہوئی۔

اوروں نے مجھے ایک رشتہ دار کی محبت دی۔ تم نے ماں سمجھ کر چاہا — اس لیے انجانے میں تم نے میرے دل میں جانے والی کی جگہ پر قبضہ جما لیا۔ مگر مجھے فکر ہے کہ تم اتنی زیادہ حساس، اتنی نازک مزاج اور اتنی (ریچی) ہو کہ بہت کم لوگوں کو اپنا بنا سکی ہو۔ دوستوں میں بھی تمہاری گہری اور پائیدار دوستی کم لوگوں سے ہوتی ہے۔ جن سے ہوتی ہے تم ان کے لیے جان دے سکتی ہو مگر یہ نہیں جانتیں کہ دوسرے تمہارے لیے جان نہیں دے سکتے۔ اور اسی کا تمہارے دل پہ گہرا اثر پڑتا ہے۔ صدمہ ہوتا ہے۔ تم روٹھ جاتی ہو — تعلقات قطع کر لیتی ہو —

مگر . . .

زندہ رہنے کا۔ خوش اور مطمئن رہنے کا یہ گُر نہیں ہے میری بچی!

زندگی کے ۸۴ سال کے تجربوں نے مجھے یہ سکھایا ہے کہ بھول جانے، معاف کر دینے، اور لوگوں کی کمزوریوں کو انسانی فطرت کی خامی سمجھ کر درگزر کر دینے میں جو مزہ ہے وہ کسی اور چیز میں نہیں۔ کم ظرفی، تنگدلی، قدر ناشناسی، ریاکاری سے دکھ ہونا قدرتی بات ہے۔ لیکن اسے ہم کیوں اپنی جان کا روگ بنائیں؟ اس سے یہ سبق لو کہ خود اپنے میں یہ خامیاں پیدا نہ ہوں۔ اور دوسروں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ دل صاف کر کے دوسروں کی بُرائیوں کو بُھلا کر ہی انسان کو سکون ملتا ہے۔

ایک بات اور ــــ

یوں تو ہر ایک اپنی فطرت اور مزاج کے مطابق اپنی سیرت کو ڈھالتا ہے ــــ لوگ کچھ کہیں میں جانتی ہوں کہ تمھارا اپنا مزاج اور طبیعت ہے ــــ

لیکن میری ایک تمنّا یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم کا گہرا مطالعہ کرکے قرآن پاک کی تلاوت، نماز کی پابندی اور دیگر ارکانِ اسلام کی پابندی کرکے تم نہ صرف میرے دل (اور میرے بعد میری روح) کو راحت پہنچاؤ گی۔ بلکہ خود اپنے لیے بھی راحت اور سکون حاصل کر سکو گی ــــ تمھارا مزاج اور طبیعت ہی اس ڈھنگ کی ہے کہ تمھیں سکون سراب کے پیچھے دوڑنے سے نہیں۔ اس چشمۂ میدان ہی سے مل پائے گا۔ سکونِ قلب اور مسرتِ حقیقی کا رستہ خدمت اور خلوص کے ذریعہ ملتا ہے تم ــــ اپنی محبت عام کر دینا۔ ہر مصیبت زدہ، ضرورت مند، محبت کے بھوکے کو یہ پیار دینا جو ایک یا چند ہستیوں کے لیے وقف ہوتا ہے!

اور . . . میں اپنے ان سب لوگوں کو تمھارے حوالے کرتی ہوں (خدا کے بعد) جو اب تک مجھ سے سہارا پاتے رہے ہیں! میری جو وصیتیں ہوں گی ان پر عمل کرنا اور کرانا تمھارا کام ہوگا۔ مجھے امید بلکہ یقین ہے کہ میرے چاہنے والے میری چیزوں یا روپوں یا کسی بھی چیز کے لیے، "مولانا یا بعض" دوسرے" لوگوں کے لیے جن کو تم جانتی ہو آپس میں لڑیں گے نہیں بلکہ میری یاد میں اپنی باہمی محبت اور رفاقت کو اور زیادہ مضبوط کر لیں گے۔ تم سب کو پیار دینا۔ تمھیں بھی ملے گا۔

خدا حافظ . . . . میرے سب پیارے دوست، عزیز، بچّے، بزرگ تم سب کو خدا کے سپرد کیا۔

ہاں میرے پڑھنے والوں نے، جن میں مخلص نوجوان خاص کر لڑکیاں اور عورتیں شامل ہیں مجھے جو قدر، محبت، اَن دیکھے اَن جانے ہمیشہ دی ہے اس کا میرے دل پر گہرا اثر ہے۔ میرے فن نے مجھے سکونِ قلب دیا ہے، دل کو راحت اور مسرت دی ہے، غم میں سہارا دیا ہے، مایوسی میں آس کی شمع جلائی ہے۔ اور تھوڑا بہت غریبی میں مدد دی ہے! لیکن پڑھنے والوں کا گہرا خلوص اور محبت وہ دولت ہے جس کا ان میں سے کوئی بدل نہیں۔

مطبع: برقی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی